دینی مدارس

اور

عصر حاضر

محمد رضوان القاسمی

مرکز دعوت و تحقیق حیدرآباد (الہند)

دینی مدارس
اور
عصر حاضر

"دینی مدارس سے متعلق اہم موضوعات پر گفتگو کی گئی ہے، نصاب تعلیم اور نظام تربیت کا خاکہ پیش کیا گیا ہے، عصری تقاضوں کی تکمیل میں جن امور کو ملحوظ رکھنا چاہئے، ان کی طرف توجہ دلائی گئی ہے، اکابر علماء کی آراء، مشورے اور تجاویز نقل کی گئی ہیں، بعض شکوک وشبہات اور غلط فہمیوں کا ازالہ کیا گیا ہے، اس موضوع پر یہ کتاب بلاشبہ مشعل راہ اور خضر طریق کا درجہ رکھتی ہے"

محمد رضوان القاسمی

مرکز دعوت وتحقیق حیدرآباد (الہند)

جملہ حقوق محفوظ

کتاب	:	دینی مدارس اور عصر حاضر (اضافہ شدہ ایڈیشن)
مؤلف	:	مولانا محمد رضوان القاسمی
زیر اہتمام	:	محمد عبدالمنان صدیقی حبیبی، ایم۔اے، ایم۔فل (عثمانیہ)
کتابت	:	محمد عرفان عالم قاسمی
سرورق	:	محمد اختر حسین
طبع دوم	:	ربیع الآخر ۱۴۱۵ھ م ستمبر: ۱۹۹۴ء
تعداد	:	ایک ہزار
قیمت	:	پچیس ۲۵ روپے Rs. 25/-

ناشر

مرکز دعوت و تحقیق حیدرآباد (الہند)

Centre for Research and Dawah

Amerah Building, Abid Road, Hyderabad - 500 001. (A.P.) India. Phone : 203668

ملنے کے پتے:

- مکتبہ ایجنسی ارم کاٹیج، اعظم پورہ، حیدرآباد Ph : 529101 (سول ایجنٹ)
- ہندوستان پیپر امپوریم، مچھلی کمان۔ حیدرآباد۔ Ph : 523011
- حسامی بک ڈپو۔ مچھلی کمان، حیدرآباد۔ Ph : 522385
- اسٹوڈنٹس بک ہاؤس، چارمینار، حیدرآباد۔ Ph : 564312
- قاضی پبلشرز اینڈ ڈسٹری بیوٹرز، ویچ بلڈنگ حضرت نظام الدین ویسٹ نئی دہلی Ph : 4617240

DARUL-ULOOM SABEELUSSALAM, Sabeel Nagar, Balapur, Barkas, Hyderabad - 500 005. (INDIA) Ph : 239450

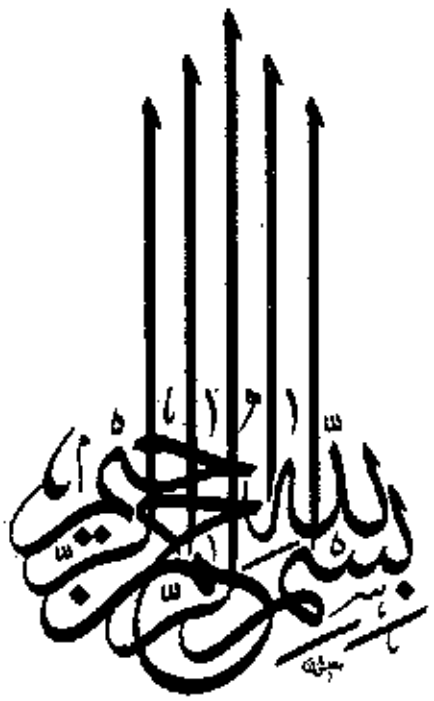
بسم الله الرحمن الرحيم

فہرست عنوانات

ایک اہم ضرورت ——— مولانا مفتی عتیق الرحمٰن عثمانی ۶
کچھ اس کتاب کے بارے میں ——— مولانا خالد سیف اللہ رحمانی ۷

دینی مدارس اور عصر حاضر

اسلام میں تعلیم کی اہمیت ... ۱۶
علماء کا منصب اور ان کی ذمہ داریاں ... ۱۷
علوم نبوت کا آخری ایڈیشن اور اس کی ابدیت ... ۱۸
تغیر پذیر دنیا میں دینی مدارس کے فرائض ... ۱۹
جدید چیلنج اور عصری تقاضوں سے مراد ... ۲۱
دینی مدارس کا نظام تعلیم — قابل تغیر اور ناقابل تغیر کی حد ... ۲۳
مدارس اسلامیہ کے نظام تعلیم میں کن اصلاحات کی ضرورت ہے؟ ۲۴
نصاب تعلیم میں جمود اور بعض مشورے ... ۲۵
غیر ضروری فنون ... ۲۹
قابل توجہ فنون ... ۳۳
جدید فنون سے احتراز، دو عظیم نقصانات کا باعث ... ۳۶
فن کی بجائے کتاب کی تعلیم ... ۳۶
انگریزی اور ہندی زبانوں کی تعلیم ... ۴۰

علماءِ اسلام اور دیگر زبان ... ۴۲
حضرت نانوتویؒ کا عزم برائے تحصیل انگریزی ... ۴۵
حضرت تھانویؒ کا قول ... ۴۷
حضرت شاہ عبدالعزیزؒ اور دیگر زبان ... ۴۸
مختصر مدتی نصاب ــــ وقت کی ایک اہم ضرورت ... ۴۹
طرزِ تدریس کی خامیاں ... ۵۲
نظامِ تعلیم، اصلاح کی ضرورت ... ۵۴
دردمندانہ شکایت، ہمدردانہ پیغام ... ۵۹
بنیادی دینی تعلیم کی اہمیت ... ۶۴
نظم و نسق ... ۶۶
مدارس کا باہمی ربط ... ۶۷
دین کے خدمت گزاروں کی خدمت میں ... ۶۷

ضمیمہ

ایک مضمون پر ناقدانہ نظر ... ۷۰
علماء کی طرف سے انگریزی تعلیم کی مخالفت حقیقت کیا ہے؟ ۸۱
دینی مدارس کا نصابِ تعلیم اہم رائیں اور مشورے ... ۸۴
دینی مدارس کی نصابی کتب فقط ایک نظر! ... ۹۸
چند تجاویز ... ۱۰۹

"اہم ضرورت"

"جہاں تک مدارسِ عربیہ اور عصرِ حاضر کے تقاضوں کا تعلق ہے، یہ عنوان وقت کی ایک اہم ضرورت کے عین مطابق ہے، ضرورت ہے کہ قدامت کی صداقت اور گہرائی اور جدّت کی بیداری اور روشنی سے پورا پورا فائدہ اٹھایا جائے۔"

(اقتباس از مکتوب گرامی مفکرِ ملّت مولانا مفتی عتیق الرحمٰن عثمانیؒ بنام مؤلفِ کتاب، ۱۹۸۱ء)

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

کچھ اس کتاب کے بارے میں

برصغیر ہند و پاک میں گذشتہ تقریباً ڈیڑھ صدی اسلام کی حفاظت و اشاعت اور اسلامی افکار و اقدار کے احیاء و بقا میں دینی مدارس اور ان کے عالی حوصلہ اور بلند نگاہ فضلاء کا جو کردار رہا ہے وہ ایک ایسی حقیقت ہے جو نگاہِ انصاف کے لئے مہرِ نیم روز سے کم نہیں، وہ نہ صرف اس تاریخ کا ایک حصہ ہیں بلکہ اس کا سرنامہ اور اس طرح کی تمام مساعی اور نیک انجام کاوشوں کا منبع و سرچشمہ ہیں، ان کی ظاہری بے سروسامانی اور دوسری طرف اسلام کے خلاف ہونے والی یورشوں کے خلاف فاتحانہ اور اثر انگیز و نتیجہ خیز مقاومت اور ملتِ اسلامیہ کی رہبری و رہنمائی کی صلاحیت میں بظاہر کوئی جوڑ نظر نہیں آتا مگر دراصل یہ قدرت کا مزاج ہے کہ "غیر معمولی" پر معمولی چیزوں کا پردہ ڈال دیا جائے اور نگاہِ بد سے اس کی حفاظت کی جائے، اس نے خاک و سنگ کے انبار میں سونے کے ذرات کو اور صدف کے بے قیمت حصار میں موتی کو چھپا رکھا ہے، اس ملک میں انہیں خس پوش اور خستہ حال درسگاہوں اور اس کے سادہ و بے رنگ فضلاء کو خدا نے اپنے "دینِ متین" کا صدف بنایا ہوا ہے اور حقیقت یہ ہے کہ ان کی اس سادگی و بے آمیزی میں

ان کا بقاء اور ارتقاء مضمر ہے۔

یہ مدارس "بند شیش محل" نہیں ہیں بلکہ امتِ اسلامیہ کیلئے بادبان اور قبلہ نما ہیں، "زمانہ" انقلابات اور تغیرات سے عبارت ہے اور دینی مدارس اور ان کے فضلاء کو اپنے عہد کی رہنمائی کا فریضہ انجام دینا ہے تو ضرورت ہے کہ ہم اپنے مسلک و مقصد پر ثابت قدم رہتے ہوئے ایسی جزوی تبدیلیاں بھی قبول کریں جن کے ذریعہ زیادہ بہتر طور پر ہم اسلام کی تعبیر و رہنمائی کا فرض ادا کر سکیں۔ اس تبدیلی سے زیادہ کوئی چیز نامبارک نہیں ہو سکتی جو مدارس کو ان کی فکری استقامت سے محروم کر دے اور ان کے حقیقی مقصدِ نشأۃ سے منحرف کر کے رکھ دے اور اس تبدیلی سے زیادہ کوئی مبارک اقدام نہیں جس کا مقصد مدارس کے مقصدِ وجود کو تقویت پہنچانا اور اس کے فضلاء کے اندر دین کی خدمت کی صلاحیت اور اہلیت کو بڑھانا اور مستحکم کرنا ہو، نہ ہر قدیم "مقدس" ہے اور نہ ہر جدید "نافع"۔ اور دراصل یہی استقامت اور جمود کے درمیان حدِ فاصل ہے!

اسی منزل کی تلاش اور اسی مقصد کے حصول کیلئے ہندوستان میں قریب قریب ایک ہی دور میں دو نصابِ تعلیم معرضِ وجود میں آئے۔ ایک ملا نظام الدین سہالوی کا نصاب جو درسِ نظامی کہلایا اور جس پر معقولات کا اتنا غلبہ تھا کہ نصاب کا ۸۰/فی صد معقولات اور ۲۰/فی صد علومِ اسلامی پر مشتمل تھا۔ دوسرا شاہ ولی اللہ صاحب دہلوی کا نصاب جس پر علومِ اسلامی اور خصوصیت سے حدیث کا غلبہ تھا اور جس نے پہلی بار "معقولیت زدہ ہندوستانی علمی فضا" میں صحاحِ ستہ کے درس کی بنیاد رکھی تھی، اس میں معقولات کا حصہ بہت معمولی تھا۔ درسِ نظامی کی حکمرانی مشرق کے علاقہ

پر ہوئی جو ہندوستان میں اس وقت علم و کمال کا دارالخلافہ تھا اور نصاب ولی اللہی نے "دہلی" میں اپنا آشیانہ بنایا جو ملک کا سیاسی دارالحکومت اور ایسا بدنصیب "لشمن" تھا جو برق کی ستم رانیوں کا خوگر ہو چکا تھا۔

پھر دیوبند کے مطلع سے علم کی ایک نئی صبح طلوع ہوئی اور اس کی تابانی و درخشانی نے جلد ہی ایک عالم کو ضیا بار کر دیا۔ اس نئی درسگاہ نے شاہ ولی اللہ کی منقولات کو اپنا اصل سرمایہ بنایا اور ملا نظام الدین سہالوی کی معقولات کو اپنا ہتھیار، اور ان دونوں نصاب ہائے تعلیم کا ایک متوازن آمیزہ تیار کیا جو اپنے عہد کی ضروریات کے لحاظ سے نہایت مناسب مفید اور نتیجہ خیز صورت تھی اور زمانہ و حالات کے لحاظ سے اس میں تبدیلی بھی کی جاتی رہی ——— وقت نے ایک اور کروٹ لی اور تحریک دیوبند کے کاز کی تقویت، علماء کے درمیان اختلاف کی خلیج کم کرنے اور "مسٹر و ملا" کو ایک دوسرے کو سمجھنے پر آمادہ کرنے کی غرض سے تحریک ندوۃ العلماء اٹھی، جس کے قافلہ سالاروں میں مولانا محمد علی مونگیری جیسے بالغ نظر درویش اور علامہ شبلی نعمانی جیسے روشن دماغ محقق و نقاد شامل تھے، ان حضرات نے مدارس کے نصاب و نظام میں حالات کے لحاظ سے مناسب تبدیلی کا آوازہ بلند کیا، علامہ سید سلیمان ندوی، مولانا حمید الدین فراہی مولانا ابوالکلام آزاد اور مولانا عبدالحمید نعمانی مالیگاؤں نے اس فکر کو تقویت پہنچائی مولانا سید ابوالحسن ندوی کے پرتاثیر قلم اور زرخیز دماغ نے اپنے رفقاء کے ساتھ نئی تبدیلیوں کو سامنے رکھ کر ایک ایسے نصابی سلسلہ کی ترتیب و تدوین کا کام سرانجام دیا جس کا اعتراف نہ کرنا علمی خیانت ہی کہلائے گا[1] اس سلسلہ میں مولانا عبدالصمد رحمانی اور مولانا وحید الزماں کیرانوی کی خدمات

---

[1] دارالعلوم ندوۃ العلماء لکھنؤ بھی اس موضوع پر اپنے یہاں مختلف تاریخوں میں اجتماعات منعقد کر چکا ہے۔

بھی بڑی قدر و قیمت کی حامل ہیں، مولانا مناظر احسن گیلانی کے گہربار قلم نے ہندوستان کے نظامِ تعلیم و تربیت پر ایسی دستاویز مرتب کر دی جو اپنی مثال آپ ہے۔

ماضی قریب کے علماء میں مولانا سعید احمد اکبر آبادیؒ، مولانا تقی امینیؒ، مولانا ابوالعرفان ندویؒ، جناب افضل حسینؒ، مولانا معراج الحقؒ دیوبند، مولانا محمد یوسف بنوریؒ، مولانا قاضی زین العابدین سجاد میرٹھیؒ اور مولانا سید منت اللہ رحمانیؒ کی تحریریں اور افکار و خیالات بھی اس باب میں سنگِ میل کا درجہ رکھتے ہیں۔

مقامِ مسرت ہے کہ مدارس آج بھی اپنی ذمہ داریوں کی ادائیگی اور ان کے لئے مطلوبہ صلاحیت داہلیت کے حصول کی مساعی سے غافل نہیں ہیں اور برصغیر کے ہر علاقہ میں اس موضوع پر سوچا اور غور کیا جا رہا ہے، اور بہ تدریج نئے تجربات بھی کئے جا رہے ہیں۔ ابھی "ملی کونسل" اس سلسلہ میں "کل ہند دینی مدارس کنونشن" منعقد کر رہی ہے[1] جس میں مختلف مسلک و مشرب کی نمائندگی ہے اور ماضی قریب میں دارالعلوم دیوبند بھی اسی طرح کا ایک ابتدائی اجتماع مسلک دیوبند کے مدارس کا رکھ چکا ہے[2]، یہ داعیانِ ملتِ اسلامیہ ہند کے شکریہ کے مستحق ہیں اور امید کی جانی چاہیے کہ مدارس کے مستقبل پر اس کا گہرا اور مفید و نتیجہ خیز اثر پڑے گا۔ وباللہ التوفیق۔

یہ "بہ قامت کہتر اور بہ قیمت بہتر" کے مصداق کتاب جو قارئین کے سامنے ہے، اس موضوع پر مشعلِ راہ اور خضرِ طریق کا درجہ رکھتی ہے جس میں نصابِ تعلیم پر عالمانہ گفتگو ہے، نظامِ تعلیم کی بابت بصیرت افروز مشورے

---

[1] بتاریخ ۲۳، ۲۴، ۲۵ ستمبر ۱۹۹۴ء بمقام دہلی [2] بتاریخ ۲۹ جولائی ۱۹۹۴ء بمقام دیوبند

ہیں، مدارس کے دفاق کی اہمیت اور اس کی تشکیل کے منہاج پر روشنی ڈالی گئی ہے، دینی تعلیم کے ساتھ ضروری عصری تعلیم کی کیا صورت ہے؟ اور عصری درسگاہوں کے طلبہ و فضلاء کے لئے دینی تعلیم کا کیا طریقہ ہو؟ اس کا خاکہ پیش کیا گیا ہے، انگریزی زبان اور علوم عصریہ کے متعلق علماء کے حقیقت پسندانہ رویہ کا اظہار اور اس سلسلہ میں زبان زد عام و خاص غلط فہمی کا ازالہ ہے۔ دینی مدارس کی اہمیت کا بیان بھی ہے اور دینی مدارس کے لئے عملی طریقۂ کار کی رہنمائی بھی۔

ان میں بعض مضامین و تجاویز وہ ہیں جو مؤلف گرامی کی طرف سے بعض سمیناروں اور اجتماعات کے لئے لکھے گئے ہیں، بعض تحریریں اس آزاد خیال کی رد میں ہیں کہ یہ مدارس فضول ہیں اور علماء نے علوم جدیدہ کی نامعقول مخالفت کی ہے، کچھ مولانا مناظر احسن گیلانیؒ، مولانا محمد یوسف بنوریؒ اور مولانا محمد تقی عثمانی جیسے اہل فکر و نظر کے چشم کشا اور بصیرت افروز اقتباسات بھی شریک ہیں اور ایک رپورٹ بھی اس میں شامل ہے جو دارالعلوم سبیل السلام حیدر آباد کے نصاب تعلیم کی ترتیب و تدوین کے موقع پر پورے ملک کے ممتاز علماء و ماہرین تدریس کی آراء و تجاویز کا خلاصہ ہے، تاہم اس کتاب کی روح مؤلف کا "دینی مدارس اور عصر حاضر کے تقاضے" کے عنوان سے کلیدی مقالہ اور دارالعلوم دیوبند کو بھیجی جانے والی تجاویز ہیں، جو ان کے فکری توازن اور ذہن رسا کے آئینہ دار اور "الدین النصیحۃ" کے عکاس ہیں ——— شاید اس میں مبالغہ نہیں کہ اس موضوع پر ہمارے یہاں ماضی قریب میں اتنی جامع و ہمہ گیر چیز نہ ملے جو دینی مدارس کے تمام ہی مسائل پر اس شرح و بسط کے ساتھ گفتگو کرتی ہو۔

یہ کتاب حضرت مولانا محمد رضوان القاسمی صاحب دامت برکاتہم کے بہار آفریں قلم سے ہے۔ اس میں کوئی شاعرانہ مبالغہ آرائی نہیں کہ مولانا کی شخصیت علم و عمل سے عبارت ہے، وقت کی نباضی اور زمانہ شناسی ان کا جوہرِ خاص ہے، فکر میں بلندی اور بلوغِ نظر ان کا سرمایہ ہے، ان کی دل نوازی، عالی ظرفی، اخلاق و مروت اور حلم و بردباری کا ہر اس شخص کو تجربہ ہے جس نے ان کے ساتھ کام کیا ہے، علمی کاموں کی حوصلہ افزائی اور اہلِ علم کی قدردانی میں انہی مثال کم ملے گی، ان کا قلم نصح و دعوت دل کو چھوتا ہے اور ان کی تنقید میں "شائستہ تیکھاپن" خموشی سے اپنے نشانہ کو مرغِ بسمل بنا دیتا ہے اور اہلِ نظر تماشائیوں کو خوب خوب لطف دے جاتا ہے۔ انہوں نے بہت لکھا ہے، مختلف دینی اور ادبی موضوعات پر لکھا ہے، اپنے صورِ قلم سے مردہ و گم نام شخصیتوں کو زندہ کیا ہے اور جو بھی لکھا ہے خوب لکھا ہے اور اصل میں ان کا میدان یہی تھا اور یہی ہے مگر افسوس کہ مردانِ کار کی کمی اور ملت کی ضروریات و مسائل کی کثرت نے ان کو مجبور کیا ہے کہ وہ اپنا بہت سارا وقت ملی، اجتماعی اور انتظامی کاموں کے لئے دیں، تاہم ضرورت ہے کہ ان کی مختلف تحریروں کے مجموعے مختلف موضوعات کے تحت الگ الگ مرتب کئے جائیں اور امید کرتا ہوں کہ مستقبلِ قریب میں یہ کام انجام پائے گا۔ وَاللہ المستعان۔

دارالعلوم سبیل السلام حیدرآباد جو جنوبی ہند کی ممتاز درسگاہ ہے، ان کے خوابوں کی تعبیر اور محنتوں کی مجسم صورت ہے، اب اس تعلیم گاہ کے ساتھ ساتھ علم و تحقیق کا ایک مستقل مرکز "مرکز البحث والدعوۃ (مرکزِ دعوت و تحقیق) مولانا بدرالحسن قاسمی اور اپنے دیگر رفقاء کے تعاون سے

قائم کرکے انہوں نے علم وتحقیق کا نیا گلستاں لگایا ہے۔ انشاء اللہ یہاں سے علومِ اسلامی کی نکہت اٹھے گی اور اہلِ ذوق ونظر اور اصحابِ دین ودانش کے مشامِ جان کو عطر بیز کرے گی، اسے فالِ نیک سمجھنا چاہیے کہ اس مرکز سے یہ کتاب "تعلیمی مسائل" پر طبع ہورہی ہے۔ خدا کرے یہاں سے علومِ اسلامی کے فروغ واشاعت، بحث وتحقیق اور دعوت وتبلیغِ دین کا ایک نیا اور تازہ دم قافلہ مرتب ہو جو تعب وتھکن سے ناآشنا رہے، فکر میں استقامت اس کا زادِ راہ ہو، پختہ علم اس کا ہتھیار ہو، دین کی حفاظت واشاعت اس کی منزل ہو اور اخلاص ورضاجوئی کا نور اس کے نوکِ قلم نوکِ زباں اور ہر عمل سے درخشاں ہو۔ وَمَاذٰلِكَ عَلَى اللّٰهِ بِعَزِيزٍ

خالد سیف اللہ رحمانی

خادم حدیث وفقہ دارالعلوم سبیل السلام حیدرآباد

۱۲ ربیع الثانی ۱۴۱۵ھ م ۱۹ ستمبر ۱۹۹۴ء

دوشنبہ

دینی مدارس اور عصرِ حاضر

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

"تعلیم" دراصل وہ بنیادی اینٹ ہے جس پر ملک وقوم اور سماج کی عملی اور فکری زندگی کی پوری عمارت کھڑی ہوتی ہے۔ اگر یہ پہلی اینٹ سیدھی ہے تو اس پر جو دیوار اٹھے گی وہ بھی سیدھی ہوگی اور اگر یہ بنیادی ٹیڑھی ہے تو "تا ثریا می رود دیوار کج"، اس لئے یہ بیک وقت زہر بھی ہے اور تریاق بھی، یہ اسی کا کرشمہ ہے جس نے ایران کے مشرکانہ خمیر سے (جو بے شمار مذاہب اور تمدن کو اپنے اندر ضم کر چکا تھا اور جس کی اباحیت پسندی اور جنس پرستی کی تاریخ پڑھ کر آج بھی شرم وحیا اور انسانیت کانپ اٹھتی ہے) یگانۂ روزگار محدثین، بالغ نظر فقہاء ومجتہدین، بلند حوصلہ داعی اور وقت کے برگزیدہ مصلحین پیدا کئے اور یہ بھی اسی کا نتیجہ ہے کہ سمرقند وبخاریٰ کی وہ مقدس محفلیں جہاں سے قال اللہ اور قال الرسول کی اٹھنے والی آوازیں پورے عالم اسلام میں گونجتی تھیں اور جہاں سے پوری دنیا کو "نالۂ نیم شبی" اور "آہ سحر گاہی" کا سبق ملتا تھا، بتدریج الحاد ودہریت کے مرکزوں اور خدا بیزاری ومذہب بیگانگی کے گہواروں میں تبدیل ہوگئی تھیں۔ فیا للاسف ویا للعجب! اور اب پھر سے وہاں نورِ حق وصداقت کے پھیلنے اور بڑھنے کے روشن امکانات پیدا ہو گئے ہیں،

فالحمد للہ علیٰ ذلک۔

تعلیم کے ان دوطرفہ اثرات پر مولانا سید مناظر احسن گیلانیؒ سابق صدر

شعبۂ دینیات جامعہ عثمانیہ حیدرآباد نے مختصر لفظوں میں بڑے بلیغ پیرایہ میں روشنی ڈالی ہے، فرماتے ہیں:

"علم کی تصحیح کا دوسرا نام ایمان ہے، عمل، علم سے پیدا ہوتا ہے، درخت پانی سے بڑھتا ہے، عمل علم سے اُگتا ہے، غلط علم، غلط عمل کو پیدا کرتا ہے، پہلے علم کی تصحیح ہونی چاہیے، یہی اصل راہ ہے۔ "اٰمَنُوا" کے مقام کی شرح ہو لے تو "عَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ" خود انسان کو لپٹ جاتا ہے۔"

(مکاتیب گیلانی مرتبہ مولانا سید منت اللہ رحمانی ص ۹۸، ۹۷)

اسلام میں تعلیم کی اہمیت

تعلیم کی یہی غیر معمولی اہمیت ہے کہ اسلام نے آکر سب سے پہلے علم و فن کے دیپ جلائے اور کفر و ضلالت کی تاریک وادیوں میں بھٹکتی ہوئی انسانیت کے سامنے اس علم حقیقی کا "آفتاب عالم تاب" روشن کیا، جس کا منبع و سرچشمہ علم ربانی تھا اور جس کا آغاز ہی اس علام الغیوب کے نام نامی سے ہوتا تھا، اِقْرَأْ بِاسْمِ رَبِّكَ الَّذِیْ خَلَقَ (پڑھ اپنے رب کے نام سے جس نے تجھ کو پیدا کیا .....) اس نے شمشیر و سناں سے پہلے کتاب و قلم تھامی، رزم جدل سے پہلے بزم علم سجائی اور زمین و تن سے پہلے دل و نظر کی دنیا کو فتح کیا، اس نے جہالت و گمراہی میں گرفتار دنیا کو للکارا کہ علم و جہل برابر نہیں ہو سکتا هَلْ يَسْتَوِي الَّذِيْنَ يَعْلَمُوْنَ وَالَّذِيْنَ لَا يَعْلَمُوْنَ (کیا جاننے والے اور انجان برابر ہو سکتے ہیں؟ .....) اس نے دنیا کے سب سے پہلے اور سب سے بڑے انسان کی "زبان حق ترجمان" سے کہلایا کہ میرا منصب

تعلیم" ہے۔ انما بعثت معلماً (میں معلم بنا کر بھیجا گیا ہوں ۔۔۔۔۔) دنیا کے درباروں اور آستانوں سے سیم و زر اور دار و در کی تقسیم ہوتی ہے لیکن اس دین متین کے آخری رسول کے "دربارِ حق شعار" سے جو دولت تقسیم کی جاتی ہے وہ یہی علم و عرفاں کا جوہر گراں مایہ ہے (انما انا قاسم واللہ یعطی (میں تقسیم کنندہ ہوں اور داتا خدا کی ذات ہے۔) یہاں علم کی طلب اور خوب سے خوب تر کی جستجو میں اس طرح تڑپنا سکھایا جاتا ہے کہ جو "قاسم العلوم" ہے خود اس کی زبان سے علم میں اضافہ کی التجا کرائی جارہی ہے کہ قُلْ رَبِّ زِدْنِی عِلْماً (کہیے: پروردگار! میرے علم میں اضافہ فرما ۔۔۔۔۔) مکہ کی زمین شور جہاں ایمان جرم تھا اور دین کی دعوت و تبلیغ سے بڑا گناہ، وہاں بھی علم دین کی یہ "دوکانِ آخرت" سجائی گئی اور مکہ کے ایک شریف النفس اور نجیب الطبع انسان" ارقمؓ کے گھر کو درسگاہِ نبویؐ بننے کا شرف حاصل ہوا، گویا یہ پہلا اسلامی مدرسہ تھا جو باطل کی تیز و تند طوفانی ہواؤں کے علی الرغم مکہ میں قائم ہوا۔ تعلیم کی یہی غیر معمولی اہمیت پیشِ نظر تھی کہ مکہ کا یہ "کاروانِ حق" جب مدینہ پہنچا تو سب سے پہلے مسجد نبویؐ اور اسی کے ایک طرف "صفہ" پر مدرسہ نبویؐ کی تاسیس عمل میں آئی، علم کی اس شمعِ فروزاں ہی نے اس دور کی جہالت کو دور کیا تھا اور اسی کا اثر تھا کہ

خود نہ تھے جو راہ پر اوروں کے ہادی بن گئے

علماء کا منصب اور ان کی ذمہ داریاں

پھر دنیا میں دولتوں اور ثروتوں کی وراثت تقسیم ہوتی ہے، جاہ و اقتدار کا ورثہ ملا کرتا ہے، لیکن "معلمِ انسانیت" صلی اللہ علیہ وسلم کے دربار مقدس سے بٹنے جانے والی وراثت یہی علمِ دین ہے۔ "العلماء ورثۃ الانبیاء" (علماء

انبیاء کے وارث ہیں) یہ حدیث جہاں ایک طرف علماء کی عظمتِ شان، ان کے جلیل القدر منصب اور عنداللہ ان کی فضیلت و برگزیدگی کو بتلاتی ہے تو وہیں دوسری طرف ان کی غیر معمولی ذمہ داریوں، ان کے عظیم الشان فرائض اور ان کی دشوار گذار راہوں کی طرف بھی توجہ دلاتی ہیں کہ اس علم نے ان کے دوش پر گراں بار ذمہ داریاں رکھ دی ہیں جن کو اپنے اپنے وقت میں اولوالعزم نبیوں اور بلند حوصلہ پیغمبروں نے انجام دیا ہے۔

علومِ نبوت کا آخری ایڈیشن اور اس کی ابدیت

کارِ نبوت دراصل ایک بڑا نازک اور دشوار کام ہے "نبی" کی حیثیت پوری انسانیت اور کائنات کی طرف سے خدا کے نمائندہ کی ہوتی ہے " وَمَا اَرْسَلْنَاكَ اِلَّا كَافَّةً لِّلنَّاسِ بَشِيْرًا وَّنَذِيْرًا (ہم نے آپ کو تمام انسانیت کے لئے خوشخبری دینے والا اور ڈرانیوالا بنا کر بھیجا ....) یعنی ایک طرف اس کا رشتہ اپنے خالق اور پالنہار سے ہوتا ہے، دوسری طرف اس کی نگاہ اپنی امت اور بندگانِ خدا پر ہوتی ہے، وہ وقت کے تیور پہچانتا ہے، حالات کی نبض تھامتا ہے، وہ اپنی بالغ نظری اور دور اندیشی سے زمانہ کے تقاضوں کو سمجھتا ہے وہ اپنی نگاہِ حق شناس اور دلِ حکمت آشنا سے عصری ضرورتوں کو محسوس کرتا ہے اور پھر ان کے سامنے "علمِ الٰہی" کی وہ قیمتی متاع اس خوش اسلوبی سے رکھتا ہے کہ دنیا اس کا وزن محسوس کرے، وہ اس پیغام میں اپنے دردِ دل کا علاج اور اپنی ضرورتوں کا نسخہ کیمیا پائے اور اس کے لئے جبین تسلیم خم کردے۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے پہلے دنیا میں مختلف انبیاءؑ آتے رہے

ان کی شریعت ان کے الہامی قوانین، ان کی کتابوں کا اسلوب اور لب ولہجہ اور دلائل و شواہد اور ان کی تعبیر پر زمانے کی گہری چھاپ تھی، ان میں عصری حالات کی، اور مخاطب کی نفسیات کی پوری پوری رعایت موجود تھی، پھر جب جب محسوس کیا گیا کہ اب زمانہ کی قدریں تبدیل ہوگئی ہیں، انسانی تمدن ارتقاء پذیر ہو چکا ہے، فکر و نظر کے زاویے تبدیل ہوگئے تو نئی الہامی کتاب، قوانین اور اسلوب کی تبدیلی کے ساتھ دنیا میں بھیجی گئی لیکن حضرت مسیحؑ کے ۵۰۰ سال بعد جب انسانیت پختہ ہو چکی تھی، تمدن جوان ہو چکا تھا، تہذیب بالغ ہو چکی تھی اور انسان فکر و نظر کے ایک قابلِ ذکر زینہ پر پہونچ چکا تھا تو اب ضرورت تھی کہ "دینِ متین" کا وہ آخری ایڈیشن انسانیت کے نام بھیجا جائے اور علم و فضل کی وہ آخری "شمع دل فراز" بنی آدمؑ کے ہاتھوں میں دیدی جائے جس میں قیامت تک نقطہ برابر بھی تبدیلی کی گنجائش نہیں ہے، اس کے لئے پیغمبر آخر الزماںؐ کا انتخاب کیا گیا، پس اب یہ دین ابدی ہے اور یہ الہامی قوانین ابدی ہیں، یہ شریعت ابدی ہے اور یہ علم اور اس کی ضرورت اور افادیت بھی ابدی ہے۔

تغیر پذیر دنیا میں دینی مدارس کے فرائض

لیکن اس کا ہرگز یہ مطلب نہیں ہے کہ وقت تھم گیا ہے، حالات کے قدم ٹھہر گئے ہیں اور زمانہ نے تغیر سے توبہ کر لیا ہے بلکہ حقیقت یہ ہے کہ "ثبات ایک تغیر کو ہے زمانے میں" عصری تقاضے جس طرح کل تغیر پذیر تھا آج بھی ہیں اور جس طرح کل علومِ الہامی میں ان حالات کی رعایت ضروری تھی اسی طرح آج بھی اس امانت خداوندی کی تعبیر میں ان تغیر پذیر قدروں کو

ملحوظ رکھنا ضروری ہے۔

ان حالات میں مدارسِ اسلامیہ کا فریضہ ہے کہ عصری حالات، ضروریات اور تقاضوں کو سامنے رکھ کر آگے بڑھیں اور علم دین کے اس مشعل کی حفاظت کریں، "اسلامی ہند" کے زوال کے بعد ہندوستان میں قائم ہونے والی اپنی نوعیت کی منفرد اور غالباً سب سے پہلی درسگاہ "دارالعلوم دیوبند" کے قیام کا منشأ بھی یہی تھا۔ دارالعلوم دیوبند محض روایتی طور پر تعلیم و تعلم اور چند فنونِ عالیہ اور آلیہ کے درس و تدریس ہی کے لئے قائم نہیں ہوا تھا بلکہ اگر اس کی قیام کے تاریخی پسِ منظر کا جائزہ لیا جائے تو محسوس ہوگا اس نے عصری چیلنج کو قبول کیا تھا، بدلے ہوئے حالات میں دین کی تعبیر اور "اظہار" کا فریضہ اپنے اوپر عائد کیا تھا اور وقت کی تیز و تند ہواؤں اور مغربی الحاد و دہریت کے طوفان صرصر میں یہ انداز خسروانہ اسلام کا چراغ روشن رکھنے کی نازک ذمہ داری اپنے سر لی تھی۔

ٹھیک اس وقت جب ہندوستان کے مغربی غاصبین نے صوفیاءؒ محدثینؒ اور فقہاءؒ اولوالعزم مبلغین کی اس سرزمین پر کہ جن کی انتھک کاوشوں اور دعوتوں سے مذہب اور اخلاقی جذبات یہاں کے ذروں میں پیوست ہو چکے تھے، کو عیسائیت اور مغربی لامذہبیت کے سانچہ میں ڈھالنے کی نامسعود مساعی شروع کر دی اور خود لارڈ میکالے کے الفاظ میں ایک ایسی نسل کی نشو و نما شروع ہو گئی، جن کو عصری درسگاہوں کے گوشت و پوست اور نام و نسب کا ہندوستانی رہنے دیا جائے لیکن فکر و نظر میں انگریز بنا دیا جائے، چند خدا ترس نفوس نے جو اپنے سینہ میں دلِ دردمند اور اپنے دماغ میں "فکرِ ارجمند" رکھتے تھے، اپنی تمامتر ظاہری بے سروسامانی اور مادی تہی دامانی

کے باوجود محض اخلاص وللّٰہیت اور صبر و توکل کا سرمایہ لے کر اٹھے اور اس "مدرسۂ عربیہ" کی بنیاد رکھی جو آج "جامعہ اسلامیہ دارالعلوم دیوبند" ہے کم و بیش دارالعلوم ندوۃ العلماء لکھنؤ بھی عصری حالات ہی کا ردعمل تھا۔

اس میں شبہ نہیں کہ ان دینی مدارس نے بڑی حد تک شہادتِ حق اور اظہارِ دین کا یہ فریضہ انجام بھی دیا اور جو کچھ دینی اثرات موجود ہیں وہ انہیں کی کیمیا اثر نگاہوں اور مسیحائی کا اثر ہے اور یہی چیز ہے جو آج کے مغرب زدہ اور دین دشمن طبقہ کی نگاہ میں کھٹکتی رہتی ہے، کہا گیا ہے "الفضل بما شهدت به الاعداء" چنانچہ آنجہانی ڈلوائی نے اپنی کتاب "ماڈرن اسلام اِن انڈیا" میں لکھا ہے کہ ہندوستانی مسلمانوں کی رجعت پسندی اور مسلم پرسنل لا وغیرہ میں ان کا مذہبی جمود اس وقت تک دور نہیں ہو سکتا جب تک مدارس کا یہ جال پھیلا رہے گا اور ان سے ملاؤں کی جماعت پیدا ہوتی رہے گی"

ہمارے بزرگوں کی اس دانشمندانہ روایت، خدا اور رسولؐ کی طرف سے عائد ہونے والی "احقاقِ حق" اور شہادت حق کی اہم ذمہ داری اور منصب علم کے تقاضوں کو پیشِ نظر رکھتے ہوئے مدارسِ اسلامیہ کا فریضہ ہے کہ وہ زمانہ کی تغیر پذیر قدروں اور بدلتے ہوئے حالات سے اپنے آپ کو ہم آہنگ کریں، نئے زمانے نے جو نئے مسائل پیدا کئے ہیں ان کو حل کرنے کی صلاحیتیں پیدا ہوں اور ہم جدید چیلنج کا مقابلہ کرنے اور ان کا سامنا کرنے کی پوزیشن میں ہوں۔

جدید چیلنج اور عصری تقاضوں سے مراد

جدید چیلنج کے مقابلہ اور عصری تقاضوں کی رعایت سے میری مراد

یہ ہے کہ طالبانِ مدارس درسگاہوں کے مضبوط حصار سے باہر نکلنے کے بعد جن حالات سے دوچار ہوں وہ ان کے لئے نامانوس اور اجنبی نہ ہوں اور وہ یہ سوچنے پر مجبور نہ ہو جائیں کہ انہوں نے اپنی عمر کا ایک معتد بہ حصہ ایک ایسے قلعہ میں بند رہ کر گذارا ہے جس کا باہر کی دنیا سے کوئی رشتہ نہ تھا بلکہ وہ اس پوزیشن میں ہوں کہ موجودہ تمدن، جس کی رگ و پے میں الحاد و دہریت کا خون دوڑ رہا ہے اور جس میں علوم و معارف کے ذریعہ خالقِ کائنات سے "جڑنے" کے بجائے "ٹوٹنے" اور "قرار" کے بجائے "فرار" کی تعلیم دی جاتی ہے، کو اسلام اور اخلاقی اقدار کے سانچہ میں ڈھال کر مسلمان بنا سکیں، اسلام کے پیش کردہ نظامِ حیات اور اس کے تمام شعبوں پر ان کو گہری بصیرت حاصل ہو۔ اسلام کے خلاف ہونے والے فکری اور نظریاتی اعتراضات سے بھی وہ نابلد نہ ہوں اور وہ اس کا مسکت جواب دینے کی پوزیشن میں ہوں۔ نیز اس پیغام کو عام کرنے کے لئے داعیانہ کردار ادا کرنے کی صلاحیت بھی رکھتے ہوں اس کا جذبہ بھی اور اس پر کامل وثوق بھی۔

جدید چیلنج کے مقابلے اور عصری تقاضوں سے ہم آہنگ ہونے سے میری مراد ہرگز یہ نہیں ہے کہ بعض "تجدد پسندوں" اور نام نہاد روشن خیالوں کی طرح زمانہ پر اسلام کی چھاپ ڈالنے کے بجائے خود اسلام کو تراش خراش کر کسی طرح موجودہ ملحدانہ تہذیب پر فٹ کر دیا جائے اور مغرب سے اٹھنے والی ہر آواز پر سمعنا و اطعنا کہہ کر اسلام پر اس کو مسلط کیا جاتا رہے۔

یہ سمجھنا انتہائی غلط ہوگا کہ چونکہ زمانہ تبدیل ہو گیا ہے، حالات بدل گئے ہیں اور معاشرتی، معاشی قدریں بدل گئی ہیں اس لئے اب کتاب و سنت اور الہامی نصوص سے ثابت ہونے والے چودہ سو سال پہلے کا اسلام نظرِ ثانی کا محتاج ہے اور اسلام کی نشأۃِ ثانیہ، اس کی نئی تعبیر اور جدید تقاضوں کی رعایت

کرتے ہوئے اس کی تعلیم کا مطلب یہ ہے کہ اس میں اپنی عقل و خرد سے اضافہ و ترمیم کو راہ دی جائے بلکہ اسلام ایک دینِ فطرت ہے، اس کے قوانین و احکام میں انسانی فطرت کی رعایت کی گئی ہے اور یہی اس قانون کی اصل روح اور اس تعلیم کے لئے اصل اور بنیاد کی حیثیت رکھتی ہے، دنیا میں یہ جو کچھ انقلابات کی بوقلمونیاں اور رنگینیاں ہم دیکھ رہے ہیں وہ محض وسائل و اسباب میں رونما ہوتی ہیں۔ انسانی فطرت اور اس کے بنیادی فطری تقاضے، اس کے احساسات اور دواعی و جذبات جو کل تھے وہی آج بھی ہیں اور ہمیشہ رہیں گے۔

دینی مدارس کا نظامِ تعلیم — قابلِ تغیر اور ناقابلِ تغیر کی حد

اس میں کوئی شک نہیں کہ مدارسِ اسلامیہ کی تعلیم، نظامِ تعلیم اور نصابِ تعلیم کا بنیادی عنصر اور مقصود ہر دور میں یکساں رہا ہے اور رہے گا، اگر اسلام ایک ابدی اور آفاقی پیغام ہے اور رہتی دنیا تک کے لئے یہ مشعلِ ہدایت ہے اور یقیناً ہے تو پھر یہ عنصر ناقابلِ تغیر ہے اور وہ یہ ہے کہ اللہ اور اس کے آخری رسولؐ نے انسان کے لئے جو دستور العمل بھیجا ہے اور جس میں پوری کائنات کی کامیابی مضمر ہے اس کو جانا جاسکے۔

لیکن اس کا ہرگز یہ مطلب نہیں ہے کہ مدارس کا پورا انتظام اور پورا تعلیمی ڈھانچہ ناقابلِ تغیر ہے اور وہ صرف ماضی کی روایات زندہ رکھنے اور بدلتے ہوئے حالات میں قدیم علوم و فنون کا "آثارِ قدیمہ" بن کر رہنے کے لئے آیا ہے۔ مدارس کی ان تغیر پذیر قدروں کو جاننے کے لئے آپ علماءِ اسلام اور مجددین و داعیانِ عصر کی تاریخ دیکھ جائیے، امام مالکؒ اور ابن شہابؒ زہریؒ سے لے کر شاہ ولی اللہ دہلویؒ، مولانا محمد قاسم نانوتویؒ اور مولانا محمد علی

مونگیریؒ تک تمام سلفِ صالحین کی اصلاحی، علمی اور دعوتی خدمات کا جائزہ لیجئے اصل روح ہر جگہ ایک ہی ہے اور وہ ہے دین کا تحفظ، اور عصری مزاج کی روشنی میں اس کی اشاعت اور احیاء۔ مگر اس کے لئے جو طریقِ کار اختیار کئے گئے ہیں وہ ایک دوسرے سے قدرے مختلف ہیں اور اپنے اپنے عہد کے لئے ضروری بھی۔

اس مرحلہ پر ہم کہہ سکتے ہیں کہ ہم کو اپنے تعلیمی نظام پر غور کرنے کی ضرورت ہے اور ضروری ہے کہ ہم اس میں مناسب ترمیم گوارا کریں نیز ہمیں اس حقیقت کا اعتراف کرنا چاہیئے کہ آج ان درسگاہوں سے فضلاء کی جو کثیر تعداد نکلتی ہے اس لحاظ سے یہ صورتِ حال کچھ امید افزا نہیں ہے اور اس کی افادیت جو ہونی چاہیئے اس لحاظ سے یہ تناسب مایوس کن ہے۔

مدارسِ اسلامیہ کے نظامِ تعلیم میں کن اصلاحات کی ضرورت ہے؟

ایسا کیوں ہے اور مدارسِ اسلامیہ کے نظامِ تعلیم کو زیادہ مفید، فعال اور جدید تقاضوں سے ہم آہنگ کرنے کے لئے کن اصلاحات کی ضرورت ہے؟ میرے خیال میں اس سلسلہ میں درج ذیل امور قابلِ غور ہیں:

۱۔ نصابِ تعلیم میں ایک گونہ جمود۔

۲۔ بعض ایسے فنون پر جو براہِ راست دین سے تعلق رکھتے تھے محض وقتی مصالح کی بناء پر ان کی تعلیم دی گئی تھی" ضرورت سے زیادہ اصرار اور ان کی جگہ جدید علوم و فنون سے بے توجہی بلکہ بے نیازی

۳۔ فن کی بجائے کتاب کی تعلیم۔

۴۔ طرزِ تدریس کی خامیاں۔

۵۔ دوسری اہم اور علاقائی زبانوں کے سیکھنے سے احتراز۔
۶۔ مدارس میں باہمی ارتباط، آپسی احترام اور نظم وضبط کا فقدان۔

اب ذیل میں ہم ان نکات کی کچھ تشریح کرتے ہیں اس کے بعد آخر میں کچھ دوسری باتیں عرض کریں گے۔

نصابِ تعلیم میں جمود اور بعض مشورے

نصابِ تعلیم میں جمود کا مطلب یہ نہیں ہے کہ آج جو کچھ کتابیں مدارسِ اسلامیہ میں پڑھائی جارہی ہیں وہ یکسر دریا برد کر دیئے جانے کے قابل ہیں۔ وہ علمی بصیرت اور دینی فہم پیدا کرنے سے قاصر ہیں اور ان کو پڑھانے کی کوئی افادیت نہیں ہے۔ یہ بات جو کہی جاتی ہے بڑی جسارت ہے۔

لیکن بایں ہمہ یہ بھی ایک ناقابلِ انکار حقیقت ہے کہ "نصابِ تعلیم" کا جو مقصود ہوتا ہے اس لحاظ سے مدارس کی مروجہ کتابوں میں سے اکثر نظرِ ثانی کی محتاج ہیں اور زمانہ کا تقاضا ہے کہ اب ان کو "کتب درس" کے بجائے "کتبِ مطالعہ" کی فہرست میں جگہ دی جائے، ایسا کیوں ہے؟ اور اس کا متبادل کیا ہے؟ اس پر تو ہم آگے گفتگو کریں گے ابھی تو ہم صرف یہ عرض کرنا چاہتے ہیں کہ وہ فنون کیا ہیں؟ جن کو آج داخلِ نصاب ہونا چاہیے، مگر وہ اس سے محروم ہیں اور دینی علوم کے وہ کون سے شعبے ہیں جو زیادہ محتاجِ توجہ تھے، مگر وہ مدارسِ اسلامیہ کی بے توجہی کے لیے شکوہ سنج ہیں۔

مغرب سے الحاد کا جو سیلاب آیا تھا اور اسلام کے پیش کردہ نظامِ حیات پر جو اعتراضات ہو رہے تھے ان کا صحیح حل یہ تھا کہ "اسرارِ

شریعتؒ کو ایک مستقل موضوع کی حیثیت سے نصاب میں داخل کر لیا جاتا، اس موضوع پر شاہ ولی اللہ دہلویؒ (متوفی ۱۱۷۶ھ) کی "حجۃ اللہ البالغہ" امام ابن قیمؒ (متوفی) کی "اعلام الموقعین" کے کچھ منتخب حصے یا امام غزالیؒ کی شہرۂ آفاق اور اپنی نوعیت کی منفرد تصنیف "احیاء علوم الدین" کے وہ ابواب جو سیاستِ مدنیہ اور معاشرت سے متعلق ہیں کو داخلِ نصاب کیا جا سکتا تھا یا اسی قسم کی کوئی اور کتاب پڑھائی جا سکتی تھی مگر چوں کہ ملا نظام الدین سہالویؒ (متوفی) کے قدیم نصاب میں اس موضوع کو کوئی اہمیت نہیں دی گئی تھی مدارسِ اسلامیہ میں ان کی پذیرائی نہیں ہو سکی، ماضی قریب میں بعض مدارس نے اس کو داخلِ نصاب کیا ہے مگر پھر بھی ان کو وہ اہمیت نہیں دی گئی ہے جو ان کا حق ہے۔

موجودہ دور میں کچھ تو نئی ایجادات اور اس سے زیادہ بین الاقوامی سطح پر قائم غیر اسلامی سیاسی اور معاشی نظام کی وجہ سے نت نئے قانونی مسائل پیدا ہو رہے ہیں، اسلامی تعلیمات کی روشنی میں ان کا قانونی حل تلاش کرنے کے لیے ضروری ہے کہ فقہی ماخذ، اصول، قواعد فقہ اور طرق استدلال پر گہری بصیرت حاصل ہو، اور اس کے لئے اصولِ فقہ اور قواعد فقہ، ان دو فنون پر زیادہ توجہ کی ضرورت ہے۔

مگر افسوس ناک بات یہ ہے کہ اصولِ فقہ میں ہمارے یہاں صرف دو تین کتابیں پڑھائی جاتی ہیں اور ان میں بھی بعض کتابیں کتاب اللہ کی بحث سے آگے نہیں بڑھ پاتی ہیں، سنت، اجماع اور قیاس کی بحث تک پہونچنے کی نوبت ہی نہیں آتی ہے حالانکہ ضرورت اس بات کی ہے کہ سب سے زیادہ توجہ "قیاس" کے مباحث پر دی جائے اور "قواعدِ فقہ" کے موضوع پر تو عام

مدارس میں سرے سے کوئی کتاب ہی نہیں پڑھائی جاتی ہے حالانکہ اس موضوع پر علامہ ابن نجیم مصری (متوفی ۹۷۰ھ) کی "الاشباہ والنظائر" بڑی بصیرت افروز کتاب ہے، ابوزید دبوسیؒ کی "تاسیس النظر" بھی احناف کے فقہی کلیات وقواعد کے موضوع پر بڑی عمدہ چیز ہے اور داخلِ نصاب کیے جانے کی مستحق ہے، نئی کتابوں میں حکومتِ عثمانیہ ترکی کے وزیر عدل علی حیدر کی گراں مایہ تصنیف "درر الحکام فی مجلۃ الاحکام" کا مقدمہ بھی داخلِ نصاب کیا جاسکتا ہے، اسی طرح "اصولِ فقہ" پر بھی زیادہ توجہ کی ضرورت ہے، نیز اس بات کی بھی ضرورت ہے کہ حنفیہ کے علاوہ دیگر فقہی مکاتبِ فکر اور علی الخصوص مالکیہ کے اصولِ فقہ کی بھی کوئی کتاب داخلِ نصاب ہو۔

پھر ہمارے نصابِ تعلیم میں "اصولِ حدیث" اور "اصولِ تفسیر" سے تو بڑی ہی غفلت برتی گئی ہے، یا تو اس موضوع پر سرے سے کوئی کتاب ہی نہیں پڑھائی جاتی ہے یا کوئی مختصر سا رسالہ پڑھا دیا جاتا ہے اور وہ بھی اس رواروی میں، گویا صرف "برکت" حاصل کرنا مقصود ہے، حالاں کہ اصولِ حدیث میں مولانا شبیر احمد عثمانیؒ کی مایۂ ناز تصنیف "فتح الملہم" کا مقدمہ سبقاً سبقاً پڑھایا جائے تو بڑا مفید ہو، اصولِ تفسیر پر متقدمین کی بہت سی عمدہ جامع، مفصل اور مختصر ہر طرح کی کتابیں ہیں، خود جلال الدین السیوطیؒ کی "الاتقان فی علوم القرآن" کے منتخب ابواب کو پڑھا دینا بہت سود مند ہوگا۔

اور شاید یہ کہنا بے جا نہ ہوگا کہ ہم نے خود قرآن مجید سے بھی بڑی غفلت برتی ہے، ہمارے یہاں عام طور پر تفسیر کی صرف دو کتابیں پڑھائی جاتی ہیں، "تفسیر بیضاوی" اور "جلالین" بیضاوی سے ظاہر ہے کہ قرآن کی اصل روح سامنے نہیں آتی بلکہ قاری صرف لفظی گورکھ دھندوں اور موشگافیوں

میں الجھ کر رہ جاتا ہے اور وہ بھی صرف سورۂ بقرہ کی حد تک ہوتی ہے۔ اور "جلالین" تو گویا قرآن کا محض عربی ترجمہ ہے۔ بس یہی کل کائنات ہے۔ ہمارے یہاں تعلیم قرآن کی، حالاں کہ اس کی شدید ضرورت ہے کہ ابتدائً مفرداتِ قرآن اور ان کی لغوی تشریح و ترکیب پر کوئی کتاب پڑھائی جائے، نمونہ کے طور پر مولانا عبدالصمد رحمانیؒ کی "تیسیر القرآن" پیش کی جاسکتی ہے پھر متوسط جماعتوں میں ترجمہ مختصر تشریح کے ساتھ تین سالوں میں پورے قرآن کا پڑھا دیا جائے اور اس کے بعد تفسیر کی مختلف کتابوں اور مختلف رنگ میں لکھی گئی تصانیف کو ملا کر پورے قرآن مجید کی تفسیر پڑھا دی جائے۔

تاریخ و سیر کو ہمارے یہاں سرے سے کوئی اہمیت ہی نہیں دی جاتی ہے حالانکہ یہ مسلمانوں کا اور علماءِ اسلام کا خاص فن تھا اور یہ ایسا فن ہے جس کے کسی بھی زمانہ میں غیر اہم ہونے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ آج اسلام کے خلاف مغربی دنیا نے جو خانہ زاد پروپیگنڈہ کر رکھا ہے، اس کی بڑی وجہ علماءِ اسلام کی تاریخ سے ناواقفیت اور بے اعتنائی ہے۔ سرکاری درسگاہوں میں یہ موضوع مستقل اور لازمی حیثیت سے داخل ہے، جہاں بطورِ خاص تاریخِ اسلامی کو بگاڑ کر پیش کرنے کی کوشش کی جاتی ہے۔

مگر ہمارے فضلاء کو ان کی ہوا تک نہیں لگتی، ادھر کی چند صدیوں کی بین الاقوامی اہم شخصیتوں کو تو چھوڑیئے، غیر مسلم تاریخ کو پس پشت ڈالیئے، خود اسلام کے قرونِ اولیٰ کی تاریخ پر ان کا انتہائی سطحی اور سرسری مطالعہ ہوتا ہے، یہ ایک المناک حادثہ ہے اس لیئے تاریخ اسلام تاریخ ہند اور تاریخ عالم کے موضوع پر بعض کتابیں ضرور داخلِ نصاب

ہونی چاہئیں۔

یہ زمانہ معروضی مطالعہ کا اور براہِ راست چیزوں کو ان کے ماخذ اور اصل مصادر سے سمجھنے کا ہے، ہمارے دشمنوں نے اسلامیات کی تعلیم اس پر گہری بصیرت اور واقفیت کے لئے بڑی بڑی درسگاہیں قائم کی ہیں۔ ہماری تاریخ، عقائد، الٰہیات، علم کلام اور فقہ و قانون پر ان کی اتنی وسیع نگاہ ہے کہ بسا اوقات حیرت ہوتی ہے وہ اس تعلیم کو اپنے ناپاک عزائم کے لئے استعمال کرتے ہیں اور اسلام پر خطرناک نشتر چلاتے ہیں۔

ضروری ہے کہ ہمارے مدارس میں کچھ ایسی کتابیں پڑھائی جائیں جن میں تمام مذاہب کا تعارف، ان کے بنیادی عقائد، ان کے معاشرتی اور معاشی اصول اور ان کے مذہبی پیشواؤں کی سیرت، ان کے اصل اور مستند ماخذ کے حوالے سے جمع کی گئی ہوں، جدید دنیا کے جو اہم معاشرتی اور معاشی نظام ہیں اور جو مشہور تخلیقی اور کائناتی نظریات ہیں، جیسے کارل مارکس، لینن، فرائڈ ڈارون وغیرہ کے افکار، ان سے طلبار کو واقف کرایا جائے، فقہ اسلامی کے خاص خاص موضوع پر "بین الاقوامی قوانین" اور "انٹرنیشنل لا" کا ایک سرسری مطالعہ بھی ان کی نظر سے گذر جائے، جب تک اس طرح تقابلی مطالعہ کا مدارس میں رواج نہ ہوگا اور تعلیم میں اس کو بنیادی اہمیت نہیں دی جائے گی جدید چیلنج کا مقابلہ ناممکن ہے، یہ بھی واضح رہے کہ نصاب کے سلسلہ میں اصلاً ان مدارس کا اقدام ہی مؤثر ہوگا جن کی حیثیت "ام المدارس" کی ہے۔

غیر ضروری فنون

ہمارے یہاں علومِ آلیہ کی حیثیت سے جو فنون پڑھائے جاتے ہیں نحو، صرف، ہیئت، ادب، قدیم منطق، قدیم فلسفہ اور معانی ـــــ ان کتابوں میں بھی معانی اور ادب پر جتنا زور دیا جانا چاہیے، نہیں دیا جاتا ہے اور ادب میں بھی جو کتابیں پڑھائی جاتی ہیں وہ زیادہ تر مقفیٰ، مسجع عبارتوں یا پھر نظم پر مشتمل ہے۔ عربی کے جدید اسلوب پر کوئی کتاب نہیں پڑھائی جاتی، اور اس پر توجہ نہیں دی جاتی کہ طلبہ عربی بولنے لکھنے کا ملکہ حاصل کر سکیں اور سب سے زیادہ ستم طلبہ پر منطق اور فلسفہ کا بارِ گراں رکھ کر کیا جاتا ہے۔ ان فنون میں عام طور پر درسِ نظامی میں "کبریٰ، مرقات، شرح تہذیب، قطبی، سلم، ملاحسن، ہدایۃ الحکمت، ہدیہ سعیدیہ، میبذی پڑھائی جاتی ہے، حالانکہ فنی اصطلاحات جاننے کے لئے صرف مرقاۃ اور "ھدایۃ الحکمۃ" کافی ہے۔ حضرت شاہ ولی اللہؒ (۱۱۱۴ـ۱۱۷۶) نے غالباً پہلی بار ہندوستان کے علماء کو اس دامِ فریب سے نکلنے کی دعوت دی (تفہیمات الٰہیہ) مگر ہندوستانی درسگاہوں میں یہ دعوت صدا بصحرا ثابت ہوئی۔ مولانا رشید احمد گنگوہیؒ (متوفی ۱۳۲۳ھ) نے اپنے زمانۂ سرپرستی میں ان فنون کو نصاب سے خارج کر دیا تھا (علماءِ ہند کا شاندار ماضی ص۷۷ ج ۵) بلکہ مولانا عاشق الٰہی صاحبؒ نے تو یہاں تک نقل کیا ہے کہ مولانا گنگوہیؒ فرمایا کرتے تھے "جو لوگ اس فن سے لگاؤ رکھتے ہیں ان کو مجھ سے فسخِ بیعت کر لینا چاہیے"۔

علماءِ متقدمین کی رائے بھی اس بارے میں کچھ اچھی نہیں تھی، علامہ مجدالدین فیروز آبادیؒ (متوفی ۸۱۷ھ) نے لکھا ہے کہ بعض علماء منطق میں مشغول ہونے کو حرام سمجھتے تھے (بصائر ذوی التمیز ص۴۰ جلد ۱) منطق اس

عہد میں کتنا مذموم فن سمجھا جاتا تھا۔ اس کا اندازہ اس سے ہو سکتا ہے کہ "طاش کبری زادہؒ (متوفی ۹۶۲ھ) نے مفسر ابو الحیان (متوفی ۷۴۵ھ) سے نقل کیا ہے کہ:

ان اهل المنطق بجزيرة الاندلس	اہل منطق جزیرۂ اندلس میں فقہاء کے
كانوا يعبرون عن المنطق بالمقفل	خوف سے، اشارہ سے منطق کے مسائل
تحرزاً عن صولة الفقهاء حتى ان بعض	بیان کیا کرتے تھے۔ یہاں تک کہ بعض
الوزراء اراد ان يشتري لابنه كتابا	وزراء نے اپنے لڑکوں کے لئے کتاب
من المنطق فاشتراه خفية خوفا منهم	خریدنی چاہی تو مارے خوف کے چھپا
(مفتاح السعادۃ ص۲۵ ج۱)	کر خریدا۔

حافظ ابن تیمیہؒ (متوفی ۷۲۸ھ) نے منطق کو علوم اسلامیہ میں داخل کرنے کی مذمت کرتے ہوئے کہا ہے کہ:

ما اظن الله ان يغفل عن المامون	میرا گمان ہے اللہ تعالیٰ مامون عباسی
العباسي ولا بد ان يعاقبه بما	سے چشم پوشی نہ کرے گا۔ اور ضرور اس کو
ادخلها على هذه الامة (اى المنطق)	سزا دے گا۔ اس لئے کہ اس نے امت محمدیہ
(کشف الظنون ص۳۵ ج ۲)	پر منطقی فنون داخل کئے۔

علامہ ابو اسحاق شاطبی مالکیؒ (متوفی ۷۹۰ھ) نے منطقی اور فلسفیانہ اصطلاحات اور فنی بحثوں کو علمائے اسلام کے لئے غیر مناسب، شرعاً غیر معتبر اور عبث قرار دیتے ہوئے لکھا ہے:

واما الثانی منهما مالا يليق بالجمهور	اور دوسرا علم جو جمہور کے لئے مناسب
فلعدم مناسبة للجمهور واخرجه	نہیں ہے اور جمہور کیلئے اسکے نامناسب
عن اعتبار الشرع له ..... كما اذا	ہونے اس کو شرعاً غیر معتبر بنا دیا ہے۔
طلب معنى الملك فاحيل به على	یہ ہے کہ جیسے فرشتہ کا معنی پوچھا جائے۔

معنی اغمض منہ وھو ماھیۃ مجردۃ او العادۃ اصلاً، او یقال جوھر بسیط ذو نھایۃ ونطق وعقل او طلب معنی الانسان فقیل ھو الحیوان الناطق المائت..... او سئل عن المکان فیقال ھو السطح الباطن من الجرم الحاوی المماس بالسطح الظاھر من الجسم المحوی..... معلوم ان الشارع لم یقصد الی ھذا ولا کلف بہ

(الموافقات، ص۵، ج۱)

اور اس سے بھی غامض اور مبہم الفاظ میں اس کا جواب یوں دیا جائے کہ "فرشتہ ایسے جوہر بسیط کا نام ہے جو فانی ہو، اور نطق (بولنے کی صراحت) اور عقل کا مالک ہے" یا یہ کہ انسان کا معنی پوچھا جائے تو کہا جائے وہ بولنے والا اور مرجانے والا جانور ہے"..... یا مکان کی حقیقت دریافت کی جائے تو کہا جائے کہ وہ جسم حاوی کی سطح باطن کے جسم محوی کے سطح ظاہر سے مس کرنے والے حصہ کا نام ہے..... یہ ایک معلوم حقیقت ہے کہ شارع نے ایسے پر تکلف معنی کا ارادہ نہیں کیا ہے اور نہ انسان کو اس کا مکلف بنایا ہے۔

بلکہ منطق و فلسفہ سے ترکیب پانے والے علم کلام کے بارے میں بھی بزرگوں کا خیال تھا کہ:

انما تؤدی الی اثارۃ الفتن والبدع وتشویش العقائد ویکون الناظر فیہ قلیل الفھم او طالب للغلبۃ لا الحق۔

(فتاویٰ تاتارخانیہ بحوالہ مفتاح السعادۃ)

وہ بدعات اور فتنوں کو ابھارنے اور عقائد کو متزلزل کرنے کا باعث بنتا ہے اور اس فن سے دلچسپی لینے والا کوتاہ فہم اور جیت کا طالب بن جاتا ہے حق کا طالب نہیں بنتا۔

شاہ ولی اللہؒ نے "انفاس العارفین" میں اپنے زمانہ کا نصاب تعلیم ذکر کرتے ہوئے منطق اور فلسفہ میں صرف دو تین کتابیں لکھی ہیں "از منطق شرح شمسیہ (قطبی) و طرح از شرح مطالع و از حکمت شرح ہدایۃ الحکمۃ"۔ یہ ہے وہ ولی اللہی نصاب جس

سے ہندوستان کی اکثر اسلامی درسگاہیں اپنا رشتہ جوڑتی ہیں۔

قابل توجہ فنون

طلبہ کی ذہنی قوت کا بڑا حصہ انہیں آثار قدیمہ کی نذر ہو جاتا ہے۔ اس کی جگہ دیگر اہم فنون ریاضی جدید فلسفہ جنرل سائنس اور جغرافیہ وغیرہ کو دی جانی چاہیئے۔ اولاً تو یہ فنون بجائے خود مطلوب ہیں۔ اور بعض حالات میں ان کی تحصیل فرض ہو جاتی ہے۔ (احیاء العلوم ج ۱) حضرت علی کرم اللہ وجہہٗ نے فرمایا:

العلوم خمسة الفقه للاديان	علوم پانچ ہیں، علم فقہ دین کیلئے، علم طب
والطب للابدان والهندسة للبنيان	(میڈیکل) جسم کیلئے، ہندسہ (انجینئرنگ) تعمیر کیلئے
والنحو للسان والنجوم للزمان۔	نحو زبان دانی کیلئے اور علم نجوم وقت کے لئے۔

اور امام شافعی (متوفی ۲۰۴ھ) کا قول ہے:

العلم علمان علم الطب للابدان وعلم الفقه للاديان

(مفتاح السعادة ص۲۷۶ ج ۱)

اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ سلف صالحین جدید علوم و فنون کے معاملہ میں کتنے وسیع النظر واقع ہوتے تھے اور اس کی تحسین کرتے تھے۔ امام غزالیؒ (متوفی ۱۲۳۱ھ) نے اپنے دور کے ان علماء پر تنقید کرتے ہوئے جو صرف "فقہ" پڑھنے پر اکتفا کرتے تھے۔ اور دیگر علوم و فنون باطنی و طبی وغیرہ سے بے اعتنائی برتتے تھے لکھا ہے:

كم من بلدة ليس فيها طبيب	بہت سے شہر ایسے ہیں جن میں ذمیوں کے
الا من اهل الذمة ولا يجوز قبول	علاوہ کوئی مسلمان طبیب نہیں ہے۔ حالانکہ ذمی
شهادتهم فيما يتعلق بالاطباء من	اطباء کی شہادت فقہی احکام میں قبول نہیں کی

احکام الفقه ثم لاتری احداً یشغل به ویتهاترون علی الفقه ولاسیما الخلافیات والجدلیات ..... هل هذا سبب الا ان الطب لیس یتیسر به الوصول الی تولی الاوقاف والوصایا وحیازة اموال الیتامیٰ وتقلد القضاء (احیاء علوم الدین صـ ۱۵)

جا سکتی، مگر ہم کسی کو طب میں مشغول ہوتے ہوئے نہیں دیکھتے ہیں۔ اور فقہ پر ٹوٹے پڑتے ہیں۔ بالخصوص اختلافی مسائل پر..... محض اس لئے کہ طب کے ذریعہ اوقاف اور وصایا کا متولی بننا اور یتیموں کے مال کا امین بننا، اور قاضی بننا آسان نہیں ہے۔

جدید چیلنج کے مقابلہ کے لئے یہ ایک ناگزیر ضرورت ہے۔ تاریخی اور قانونی حیثیت سے اسلام کو جو چیلنج درپیش ہے اس کے مقابلے کے لئے سلف صالحین نے جو کچھ لکھ دیا ہے وہ کافی ہیں۔ بشرطیکہ ان کو وسعتِ نظر کے ساتھ نصابِ تعلیم میں جگہ دی جائے لیکن "علم کلام" یعنی اسلام کے فلسفۂ الٰہیات کو "آج کی چیز" بنانے کے لئے جدید فلسفہ کی تعلیم ضروری ہے۔ اولاً تو یہ جدید فنون بے کار نہیں کہے جا سکتے لیکن اگر کسی غیر مفید یا غیر مطلوب علم کا حاصل کرنا کسی فتنہ کے لئے ناگزیر ہو جائے تو اسے بھی حاصل کیا جائیگا۔

امام غزالیؒ فرماتے ہیں:

وبعضها (ای العلوم) خوض فیما لایتعلق بالدین ولم یکن شیئ منه مالوفاً فی العصر الاول وکان الخوض فیه بالکلیة من البدع ولکن تغیر الآن حکمه اذ حدثت

اور بعض علوم میں اہل فن ان امور میں سے منہمک ہوتے ہیں جن کا دین سے کوئی تعلق نہیں، حالانکہ قرن اوّل میں یہ چیزیں مروج نہ تھیں، ایسے امور میں انہماک کلیتہً بدعت ہے۔ لیکن اب اس کا حکم بدل گیا۔ اس لئے

البدعة الصارفة عن مقتضى القرآن والسنة الخ

کہ اب قرآن وحدیث سے پھیرنے والی بدعت (یعنی جدید فنون) پیدا ہوگئی۔ پس وہ ممنوع ضرورتاً جائز ہوگیا (تاکہ ان فنون پر بصیرت حاصل کرکے معترضین کا ناقدانہ جائزہ لیا جاسکے)

(احیاء علوم الدین ص۲۳ ج۱)

اس لئے مدارس میں ان جدید فنون کی اس حد تک تعلیم دینا ضروری ہے کہ وہ اس چہار دیواری سے باہر نکلنے کے بعد اپنے ذوق ومزاج کے مطابق عصری درسگاہوں میں ان فنون کی اعلیٰ تعلیم حاصل کرسکیں، البتہ ان فنون کی تعلیم متوسطات تک ہی دی جائے تاکہ منتہی درجات میں کتابوں کا غیر معمولی بوجھ نہ ہوجائے۔

دینی مدارس کے نصابِ تعلیم میں عصری فنون کے شامل کرنے کے سلسلہ میں حجۃ الاسلام مولانا محمد قاسم نانوتوی کا نقطۂ نظر بھی سامنے رکھ لینا مناسب ہے، وہ فرماتے ہیں:

"زمانۂ واحد میں علوم کثیرہ کی تحصیل سب علوم کے حق میں باعثِ نقصانِ استعداد رہتی ہے ہاں بعد تحصیل فنونِ دانشمندی جس کو خاص تحصیلِ استعداد ہی کے لئے تجویز کیا گیا ہے، اگر اور فنونِ قدیمہ وجدیدہ کو حاصل کیا جائے گا تو البتہ مقدارِ زمانۂ تحصیل برابر رہے گا، اس تقدیم تاخیر سے مطلب بخوبی حاصل ہوگا اور استعداد ہر علم کی بخوبی حاصل ہوگی، اسلئے علوم نقلیہ اور اُن کے ساتھ علوم دانشمندی کو داخلِ تحصیل کیا۔ اس کے بعد اگر طلباء مدرسہ ہذا مدارسِ سرکاری میں جاکر علوم جدیدہ کو حاصل کریں تو اُن کے کمال میں یہ بات زیادہ مؤید ہوگی۔"

(روداد ۱۲۹۰ھ ص۱۳)

جدید فنون سے احتراز، دو عظیم نقصانات کا باعث

علماء کے جدید فنون سے احتراز برتنے کی وجہ سے دو ناقابل تلافی نقصان پہنچے ایک یہ کہ امت جدید و قدیم دو گروہوں میں تقسیم ہو گئی، اور پھر اس جدید و قدیم نے دو "دینی اور لادینی" جماعتوں کی شکل اختیار کر لی، اور اس تقسیم کا عام ذہن پر یہ اثر پڑا کہ "اسلام" جدید تحقیقات اور علم و عقل کا ساتھ نہیں دے سکتا۔ دوسرے یہ کہ جس طرح متقدمین نے عصری تحقیقات اور اس زمانہ کے جدید فلسفہ کی روشنی میں اسلام کے مابعد الطبیعی اعتقادات کو ثابت کیا تھا۔ ہمارے دور کے علماء عصر حاضر کے سائنسی انکشافات کو پیش نظر رکھتے ہوئے ایسا "جدید کلام" مرتب نہ کر سکے۔ حالانکہ اس موضوع پر لکھی گئی ایک آدھ کتاب سے معلوم ہوتا ہے کہ ان جدید تحقیقات سے اسلام کے نقطہ نظر کو غیر معمولی تقویت پہنچتی ہے،

"فن" کے بجائے "کتاب" کی تعلیم

تیسری بنیادی کمزوری ہمارے مدارس کی یہ ہے کہ نصاب میں ایسی کتابیں داخل ہیں جن میں فنون سے زیادہ لفظی بحثوں، ترکیبوں، دور از کار اشکالات اور ان کے جوابات وغیرہ پر توجہ دی گئی ہے، ہلکی پھلکی بات بتانے کیلئے بھی مشکل پیرایہ استعمال کیا گیا ہے اور جن مسائل کو ٹھیٹ الفاظ میں ادا کیا جا سکتا تھا۔ ان کے لئے بھی ایسی اصطلاحات کا استعمال کیا گیا ہے کہ عبارت اور بھی ژولیدہ ہو کر رہ جاتی ہے۔ متقدمین کا بھی یہ اسلوب تحریر نہیں تھا اور ماضی قریب کے مصنفین بھی اس اسلوب کو پسند نہیں کرتے۔ بیچ کے ادوار میں جب عالم اسلام پر منطق اور فلسفہ کا غلبہ تھا۔ ہر فن کو اسی معقولی رنگ میں ڈھالنے کی کوشش کی گئی اور اسی طرز تعبیر کو زیادہ مقبولیت بھی حاصل ہوئی۔ مثال کے طور پر علامہ سعد الدین تفتازانیؒ کی کم از کم دو کتابیں "شرح عقائد نسفی" "مختصر المعانی" تقریباً ہندو پاک کے تمام

قابل ذکر مدارس ہیں داخل نصاب ہے اور اول الذکر کتاب "علم کلام و عقائد" میں ہے اور ثانی الذکر "بلاغت و معانی" میں ان دونوں کتابوں پر طلبہ کو جتنی ذہنی قوت، خرچ کرنی پڑتی ہے شائد کسی دوسری کتاب پر کم از کم اس سے زیادہ محنت درکار نہیں ہوتی لیکن اتنی محنت کے باوجود ان فنون پر ان کو کوئی بصیرت نہیں ہوتی۔ اس کا اندازہ اس سے ہوگا کہ مختصر المعانی کے ایک ایسے طالب علم سے جس نے اپنے استاذ کی تقریر زبانی یاد کر رکھی ہے، مصنف کے "نظریات" کو اپنے حافظہ میں مستحضر کر لیا ہے اور اپنی طباعی سے عبارتیں حل کرنے میں ایک سے ایک نکتہ پیدا کرتا ہے کسی آیت قرآنی کے بارے میں پوچھ دیا جائے کہ اس میں کیا کچھ بلاغتیں ہیں؟ اور اگر ان الفاظ کے بجائے ——— یہ الفاظ ہوتے تو کیا حرج ہوتا؟ تو عموماً یہ سوال اس کیلئے عقدۂ لاینحل ثابت ہوگا!

ہم اس سلسلہ میں خود کچھ لکھنے کے بجائے مولانا محمد یوسف بنوریؒ جو قدیم و جدید کا حسین امتزاج ہونے کے علاوہ بڑی دور رس، زمانہ شناس اور مصلحت آشنا نگاہ رکھتے تھے، کے چند اقتباسات نقل کرنے پر اکتفا کرتے ہیں:

"مدارس دینیہ عربیہ میں اس وقت جو نصاب تعلیم رائج ہے، حدیث و فقہ کی چند کتابوں کو مستثنیٰ کرنے کے بعد زیادہ تر ساتویں ہجری اور اس کے بعد کے قرون کی یادگار ہے۔ جہاں سے صحیح معنوں میں علمی انحطاط کا دور شروع ہو چکا تھا۔ قدما مامت کی وہ تالیفات جن میں نہ عبارتی تعقیدات تھیں نہ دور از کار السحاث جن کے پڑھنے سے صحیح معنوں میں دل و دماغ متاثر ہو سکتے تھے، نہ وقت ضائع ہوتا تھا، نہ دماغ پر بوجھ کا خطرہ ہوتا تھا۔ ان کی جگہ ایسی کتابیں تصنیف ہوئیں جس میں سب سے زیادہ کمال اختصار نویسی کو سمجھا گیا۔ زیادہ زور لفظی بحثوں پر دیا گیا۔ لفظی موشگافیاں شروع ہوئیں۔ یوں اگر کہا جائے مبالغہ نہ ہوگا کہ کاغذ تو کم خرچ کیا گیا لیکن وقت و دماغ کو اس کے حل پر زیادہ صرف کیا گیا۔ بڑا کمال یہی سمجھا گیا کہ عبارت ایسی دقیق و غامض ہو، جس کیلئے شرح و حاشیہ کی ضرورت

ہو۔ کئی کئی توجیہات کے بغیر حل نہ ہو۔ آخر یہ علمی عیاشی نہیں تو اور کیا ہے، میرے ناقص خیال میں یہ علم کا سب سے بڑا فتنہ تھا جس سے علوم اور اسلامی معارف کو بڑا نقصان پہونچا۔ بطور مثال اسلامی علوم میں اصولِ فقہ لیجئے جو علوم دین اور علوم اجتہاد میں ایک لطیف ترین اور اہم ترین فن ہے۔ جو قرآن و سنت سے نئے نئے استنباطات کے لئے سب سے اہم راستہ تھا جسکی باقاعدہ تدوین کا فخر دولتِ عباسیہ کے سب سے پہلے قاضی القضاۃ امام ابو یوسفؒ کو حاصل ہے اور امت میں اس کے بعد سب سے پہلی کتاب امام محمد ابن ادریس الشافعیؒ کی کتاب "الرسالۃ" ہے جو عرصہ ہوا کہ مصر میں "کتاب الام" کے نام کے ساتھ چھپ چکی تھی، اور اب کچھ عرصہ ہوا بہت آب و تاب سے دوبارہ قاہرہ سے شائع ہوئی ہے۔ اسی فن میں امام ابو بکر رازیؒ جصاصؒ (متوفی ۳۷۰ھ) نے کتاب "الفصول فی الاصول" لکھی جس کا ایک عمدہ نسخہ دار الکتابت المصریہ قاہرہ میں موجود ہے اور جس کی نقل راقم الحروف کے توسط سے مجلس علمی ڈابھیل حال کراچی کے لئے.... ہندوستان و پاکستان آئی۔ امام فخر الدین بزدویؒ نے "کتاب الاصول" لکھی جس کی عمدہ ترین شرح عبد العزیز بخاریؒ نے کی ہے جو ترکی کے سابق دار الخلافہ سے دو دفعہ شائع ہوئی اور محیر العقول عظیم ترین شرح امیر کاتب عمید الدین اتقانیؒ کی "الشامل" دو جلدوں میں دار الکتابت المصریہ قاہرہ میں موجود ہے۔ اور اس کا ایک نسخہ استنبول کے کتب خانہ فیض اللہ آفندی میں ہے لیکن افسوس کہ دونوں جگہ ابتدائی دو ڈھائی جز کا نقص ہے۔ اس کی نقل بھی راقم الحروف کے توسط سے مجلس علمی میں آچکی ہے، امام شمس الائمہ سرخسیؒ نے "کتاب الاصول" لکھی جس کے نسخے ترکی و مصر میں موجود ہیں، یہ اور اس کے علاوہ اس فن میں متقدمین کی عمدہ و نافع کتابیں ہیں۔ اس کے علاوہ اس فن میں امام ابو زید دبوسی کی کتاب "تقویم الادلہ" بے نظیر ہے۔

اب خیال فرمائیے کہ ایسی نادرۂ روزگار کتابوں کی جگہ امام ابن ہمام کی "تحریر الاصول" اور ابن حاجبؒ کی "مختصر الاصول" اور بیضاویؒ کی "منہاج الاصول" یا ابو البرکات نسفیؒ کی "منار الاصول" یا صدر الشریعہ کی "التنقیح" اور قاضی بیضاوی کی "منہاج"

کی شرح الاسنوی کی۔ ہو تو یہ چیستانیں امت کے کیا کام آسکتی ہیں ؟ یہ مانا کہ ان میں کچھ دقیق ولطیف ان کے مختارات یا خصوصی ابحاث بھی ہیں لیکن دوسری طرف امہات جس تعبیر میں ادا ہوئی ہیں وہ کوئی علمی روح پیدا کرنے کیلئے مفید نہیں ہوسکتیں۔"

(ماہنامہ الفرقان: بابت ماہ فروری و مارچ ۱۹۵۸ء)

دوسری جگہ رقم طراز ہیں:

"ہر زمانہ کا ایک خاص مزاج اور خاص ذوق ہوتا ہے، جب علم کی صحیح ترقی ختم ہوگئی، یا رک گئی یا یوں کہیئے کہ معراج کمال تک مبادی علوم کا معیار جب بلند ہوا تو طبعی طور پر علوم اسلامیہ کا انحطاط لازمی تھا۔ اب سارا زور وکمال، تالیف کا معیار قواعد کی تلخیص، مسائل کی تنقیح، عبارت آرائی، متن نویسی و ایجاز طرازی، اختصار کے نئے نئے اسلوب لفظی موشگافی وغیرہ قرار پایا۔ علمی مسابقت کا میدان بھی بن گیا منظوم قواعد تیار ہونے لگے مبادی و مسائل مقاصد بن گئے۔ علوم عربیہ کا مقصد قرآن و حدیث کی تراکیب اپنی جگہ رہیں۔ خود ان کتابوں کے مسائل و عبارات مرکز توجہ بن گئے ابن حاجب کی کافیہ کو لیجئے جس کی پچاس سے زیادہ شرحیں لکھی گئیں، پھر "شرح ملا جامی" جو ان شرحوں میں سے ایک شرح ہے اس کے حواشی اور شروح کے لئے ایک دفتر چاہیئے۔ اس پر اس کی شرح عبدالغفور کو لیجئے۔ پھر اس کا تکملہ عبدالحکیم سیالکوٹی اور ان دونوں کی شرح، اور اُن میں سے "شرح" اشمونی" اور پھر اس کی شرح "صبان" سات ضخیم مجلدات میں دیکھئے کہ ساری عمر ان ہی کے مطالعہ کی نذر ہو جائے۔ آخر غور کیا جائے کہ کیا یہ مبادی واقعی اتنی توجہ کے مستحق تھے۔ بہرحال جو کچھ ہوا ایک خاص دور کا تقاضہ تھا۔ اور ذوق طلب تھا جو پورا ہوگیا۔ اسی طرح بقیہ علوم وبقیہ کتب کی حالت کو قیاس کر لیجئے۔ اب نہ تو طبائع میں وہ جولانی رہی اور نہ وہ جفاکشی محنت و عرق ریزی کی صلاحیت دماغوں میں رہی، نہ وہ فرصت وطمانیت رہی اور سب سے بڑی بات یہ کہ نہ اس کی حاجت رہی۔ مشکل پسندی سے فکر اکتانے لگی۔ جدید کتابیں لکھی

گئیں۔ ادب و انشاء کا طرز و اسلوب بدل گیا۔ قدماء کی کتابیں پریس میں آنے لگیں اہل عصر نے ہمت کر کے ذوقِ عصری کی تشنگی کے لئے جدید سانچوں میں ضیافت طبع کی خاطر عمدہ تصنیفات پیش کیں۔ اس ماحول میں اگر ہم اب بھی ان غیر اہم وسائل پر جمے رہیں گے تو علوم اسلامیہ سے توجہات ہٹ جائیں گی۔ اور ہمارا یہ طرزِ عمل ہمارے اکابر و سلف کی اس "تراث فاخر" اور اس علمی ثروت و سرمایہ کو فنا کے گھاٹ اتار دے گا۔ یہ درحقیقت علم کی خیر خواہی نہیں بلکہ نادان دوست کا سا طرزِ عمل ہوگا۔ کیا فقہ اسلامی میں کنز الدقائق وقایہ، نقایہ، اور شرح وقایہ کے بہترین بدل اسلاف ہی کی کتابوں میں موجود نہیں کیا جامع صغیر، جامع کبیر وغیرہ براہِ راست ..... امام محمد بن حسن الشیبانی کی کتابیں ہر حیثیت سے جامع نہیں ہیں؟ ان میں جو علم و برکت ہوگی وہ ان متاخرین کی کتابوں میں کہاں سے ملے گی۔ میرے ناقص خیال میں کتب فقہ میں نور الایضاح قدوری اور ہدایہ کے علاوہ بقیہ سب قابل تبدیلی ہیں۔ (ایضاً: ص ۶۶، ۶۵)

انگریزی اور ہندی زبانوں کی تعلیم

"آزادی کے بعد" اور "آزادی سے پہلے" کے ہندوستان کا معاملہ یکساں نہیں ہے۔ آزادی سے پہلے اس ملک میں مسلمان "حکمراں اور مقتدر" کی حیثیت سے رہ رہے تھے، اس وقت ان کی زبان، اس ملک کی زبان، حکومت کی زبان، علم و ہنر کی زبان اور تعلیم کی زبان تھی مگر اب معاملہ اس کے بالکل برعکس ہے۔ اب برادرانِ وطن کی تہذیب، ان کا کلچر اور ان کی زبان ہی کو "مقتدیٰ" کی حیثیت حاصل ہے، اس ملک میں انہیں کی غیر معمولی اکثریت ہے اور ہماری زبان کو یہاں کے "سیاسی حالات" نے "پرائی زبان" بنا دیا ہے۔ اس کے علاوہ آج سے چند صدی پہلے

بین الاقوامی سطح پر مسلمانوں کی ساکھ قائم تھی، ان کی زبان علم و تحقیق کی زبان، ترقی یافتہ صنعت و ٹکنالوجی کی زبان اور اربابِ فکر و نظر کی زبان تھی، اس لئے اس کو اپنوں کے علاوہ بیگانے اور دوستوں کے علاوہ دشمن بھی سیکھا کرتے تھے مگر اب معاملہ اس کے برعکس ہے۔ آج کی دنیا میں بین الاقوامی سطح پر صنعتی اور علمی زبان انگریزی ہے اور جغرافیائی اعتبار سے ہمارے لئے اس کے بعد بلکہ بعض حیثیت سے اس سے زیادہ اہم "ہندی زبان" ہے۔ اس زبان میں پوری منصوبہ بندی سے اسلامی سرمایہ کو ظاہری اور معنوی خوبیوں کے ساتھ منتقل کرنے کی ضرورت ہے۔

یہ حقیقت ہے کہ علماء چوں کہ ان زبانوں سے ناآشنا ہیں اس لئے ان کو ان زبانوں میں پھیلائی جانے والی بدگمانیوں اور غلط فہمیوں کی کوئی خبر نہیں ہوتی اور نئی نسل (جس نے اقتصادی اور صنعتی تقاضوں کے پیشِ نظر انہیں زبانوں کو پڑھا ہے) یا دوسری قومیں جب اسلام کا مطالعہ کرنا چاہتی ہیں تو اسی زبان کے لٹریچر پڑھتی ہیں جو اکثر مستشرقین اور اسلام دشمن مصنفین کی ہوتی ہیں اور اسلام کی طرف سے ان کے دل میں نفرت کے تخم پڑ جاتے ہیں۔ اس طرح بہت سے دکھے ہوئے بے چین اور مضطرب "دل و دماغ" جو حق کی تلاش میں "قبولِ حق" کا جذبہ لے کر اسلام کی طرف بڑھتے ہیں، بدگمانی اور نفرت کے احساسات کے ساتھ واپس ہو جاتے ہیں۔ ہمیں اس کا اعتراف کرنا چاہئے کہ اس میں بڑی حد تک ہماری غفلت کو دخل ہے۔" جدید چیلنج کے مقابلہ کے لئے ناگزیر ہے کہ کم از کم ان دو زبانوں پر اسلامی درسگاہوں سے نکلنے والے طلباء ایسی نظر رکھتے ہوں کہ بے تکلف اسلام کے ناقدین کو پڑھ سکیں اور جدید حلقہ

میں داعیانہ کردار ادا کرسکیں " فارسی" اسلام کی الہامی زبان نہیں ہے مگر ہمارے بزرگوں نے دعوتی نقطۂ نظر سے اس پر ایسی مہارت حاصل کی کہ آج "فارسی" کو مسلمانوں سے علیحدہ کرکے سوچا بھی نہیں جاسکتا۔ اسلام نام "زبان" کا نہیں ہے "پیغام" کا ہے۔ اس پیغام کو عام کرنے کیلئے ہمیں اپنے سلف کے نقشِ قدم پر چلتے ہوئے ان زبانوں پر ایسی مہارت حاصل کرنی چاہیئے کہ ہمارے لئے وہ پرائی زبان محسوس نہ ہو۔ آخر زید بن ثابتؓ جو چھ زبانوں کے ماہر تھے، ہمارے ہی اسلاف میں سے تو ہیں؟ قرآنی آیت وَمَآ اَرْسَلْنَا مِنْ رَّسُوْلٍ اِلَّا بِلِسَانِ قَوْمِهٖ (ہم نے رسولوں کو ان کی قومی زبان میں پیغام لے کر بھیجا) کا مفہوم اور تقاضا بھی یہی ہے۔

علمارِ اسلام اور دیگر زبان

یہاں موضوع کی مناسبت سے جی چاہتا ہے کہ مولانا سید مناظر احسن گیلانیؒ نے اپنی مشہور و معروف کتاب "ہندوستان میں مسلمانوں کا نظامِ تعلیم و تربیت" (جلد دوم) میں علمار اور اسلاف و اکابر کے سلسلہ میں دیگر زبانوں سے دلچسپی کے جو واقعات قلمبند فرمائے ہیں، ان پر آپ ایک نظر ڈال لیں۔ اس سے دو فائدے ہوں گے، ایک تو اس دور کے علمار و فضلار کو عربی، اُردو اور فارسی کے ساتھ دیگر زبانوں کے حصول کا شوق پیدا ہوگا اور دوسرے بعض گوشوں اور حلقوں میں اس تعلق سے جو غلط فہمیاں پائی جاتی ہیں، ان کا ازالہ ہوگا ——— اقتباس قدرے طویل ضرور ہے لیکن نہایت معلومات افزا اور دل اور دماغ دونوں کو متوجہ کرتا ہے، مولانا گیلانیؒ تحریر فرماتے ہیں:

"پڑھنے پڑھانے کے بعد کسی جدید زبان یا علم کے سیکھنے کی ضرورت

اگر کسی بڑے عالم کو پیش آگئی ہے تو پیرانہ سری بھی اس ضرورت کی تکمیل میں رکاوٹ نہیں پیدا کر سکتی تھی، مولانا عنایت رسول چریاکوٹی کے متعلق لکھتے ہیں کہ فارغ التحصیل ہونے کے بعد عبرانی زبان سیکھنے کا شوق پیدا ہوا۔ تذکرۂ علماءِ ہند میں ہے:

"بشوق اموختن زبان عبرانی بکلکتہ	عبرانی زبان سیکھنے کے شوق میں کلکتہ تشریف
رفتہ درآنجا سالے چند پابند اقامت	لے گئے اور کئی سال رہ کر علماءِ یہود سے
گشتہ از احبار (یا حام) زبانِ	عبرانی زبان سیکھی اور اچھی استعداد
عبرانی بجمیع الوجوہ آموخت" (ص۱۵۲)	پیدا کی۔

عبرو (عبرانی) زبان میں مولانا کو جو دست گاہ حاصل تھی اس کا اندازہ ان کی کتاب "بشریٰ" اور اس رسالہ سے ہو سکتا ہے جو حضرت ہاجرہؑ ام اسماعیل علیہما السلام کے متعلق آپ نے عبرانی حوالوں سے مرتب فرمایا تھا، سرسید احمد خاں نے اپنی مشہور کتاب "خطباتِ احمدیہ" کا جزو بنا کر اسے شائع کیا ہے۔

علامہ تفضل حسین خاں کا ذکر پہلے کہیں گذرا ہے، یہ بھی ان ہی سے لوگوں میں ہیں جنہوں نے تحصیلِ علومِ رسمیہ کے بعد

"انگریزی و رومی آں را لاطینی	انگریزی اور رومی زبان سیکھی جسے
نیز گویند، یونانی را نیکو گفتے و	لاطینی بھی کہتے ہیں، یونانی خوب
خواندے و نوشتے"	اچھی بولتے، پڑھتے اور لکھتے۔

(نجوم السماء ص ۳۲۴)

چڑیاکوٹ ہی کے ایک اور بزرگ قاضی غلام مخدوم چریاکوٹی ہیں، صاحبِ تذکرۂ علماءِ ہند نے ان کے متعلق لکھا ہے:

"بعد تکمیل علوم متداولہ شوق تعلم	علومِ متداولہ کی تکمیل کے بعد

زبان سنسکرت در دلش پدید آمد	سنسکرت کا شوق پیدا ہوا اور
تا اینکہ در تحصیل زبانِ مذکور خطے	اچھی مہارت پیدا کی۔ بنارس جو
وافی برگرفت و بمقام بنارس کہ	اس زبان کے لیے مرکز کی حیثیت
معدن ہر زبان مرقوم است میان	رکھتا ہے، یہاں ماہرانِ سنسکرت
ماہرانِ ایں فن امتیازے کافی یافت	میں امتیازی مقام حاصل کیا۔

(ص: ۱۵۷)

مولوی نصرت علیخاں دہلوی تخلص قیصر کے متعلق بھی اسی کتاب میں ہے:

"علوم رسمی باستعداد حاصل نمود ماہر	مروجہ علوم میں استعداد مہم پہنچائی
زبان فارسی و عربی و ترکی و انگریزی	چنانچہ فارسی، عربی، ترکی، انگریزی
و ہندی ست" (ص ۲۳۷)	اور ہندی پانچ زبانوں کے ماہر ہیں

ان ہی مولوی نصرت علی کے والد ماجد مولوی ناصر الدین جو عیسائیوں کے ساتھ اپنے زمانہ میں چوں کہ سب سے زیادہ مناظرہ کرنے والے تھے اسلئے لوگوں میں "امام فن مناظرہ" کے لقب سے مشہور تھے، کنیت ابو المنصور تھی، ان کے متعلق بھی لکھا ہے:

"اکتساب علوم از والد ماجد و جدِ	اپنے والد ماجد اور دادا بزرگوار
امجد خود نمودہ"	سے علم حاصل کیا۔

جب عیسائیوں سے مناظرہ کی مہم سامنے آئی تو:

"تورات و انجیل بالتفسیر عبرانی و یونانی	توریت و انجیل یونانی اور عبرانی تفسیر
از علماءِ اہلِ کتاب خواندہ" (ص ۲۳۲)	کے ساتھ علماءِ اہلِ کتاب سے پڑھیں،

مولوی نجف علی جھجر کے رہنے والے نواب ٹونک محمد علی خاں کے دربار کے مولوی تھے، لکھا ہے کہ "پنجاہ رسائل بالسنۂ خمسہ کہ دری و پاژندی

عربی و فارسی و اردو عبارت از آنست" (تذکرۂ علماء ہند۔ ص ۲۳۶) جس کا یہی مطلب ہے کہ عربی، فارسی، اردو کے سوا دری اور پاژندی زبانوں کو بھی انہوں نے تحصیلِ علم کے بعد کسی پارسی عالم سے سیکھا تھا، حالانکہ خود عربی زبان میں ان کو اتنی قدرت حاصل تھی کہ:

"شرحِ مقاماتِ حریری بہ زبانِ عربی بہ صنعتِ اہمال تصنیف کرد"

مقاماتِ حریری کی شرح عربی زبان میں اس طرح کی کہ کہیں نقطہ والا حرف نہیں لائے۔

❊ ❊ ❊ ❊

پوری حریری کی شرح غیر منقوط الفاظ میں کرنا آسان نہیں ہے، ان کے متعلق یہ بھی بیان کیا ہے کہ پارسیوں کی مذہبی کتاب "وساتیر" کی ایک شرح "ویمزا" نامی پاژندی زبان میں اور "رمان سفرنگ" دری زبان میں لکھی تھی۔

مختلف زبانوں کے سیکھنے کا مسلمانوں میں جو مذاق تھا اس کا اندازہ آپ کو اس واقعہ سے ہو سکتا ہے، حافظ ابن حجر نے "درر کامنہ" میں آٹھویں صدی کے ایک بغدادی عالم زین الدین العابر کے ترجمہ میں لکھا ہے کہ تاتاری نومسلم بادشاہ غازان خاں، جب آپ کے مدرسہ میں آیا اور آپ سے ملا تو بالغ فی الدعاء (یعنی اس نومسلم بادشاہ کو شیخ نے بہت دعائیں دیں) یہ دعائیں کن کن زبانوں میں کی گئیں؟ حافظ لکھتے ہیں "بالعلی ثم بالترکی ثم بالفارسی ثم بالرومی ثم بالعربی" جس سے معلوم ہوا کہ ان پانچ زبانوں پر ان کو قدرت تھی، ہفت زبان کا لفظ مسلمانوں میں مروج بھی تھا۔ (دیکھئے ج ۲ ص ۲۲)۔

حضرت نانوتویؒ کا عزم برائے تحصیلِ انگریزی

"مولانا گیلانیؒ" مزید لکھتے ہیں "اس سلسلہ کی ایک دلچسپ بات وہ ہے جسے براہِ راست اس فقیر

نے مولانا حافظ محمد احمد مرحوم سابق مہتمم دارالعلوم دیوبند سے سنی تھی، اپنے والدِ مرحوم حضرت مولانا محمد قاسم نانوتوی بانی دارالعلوم کے متعلق یہ قصہ بیان کرتے تھے کہ آخری حج میں جب جارہے تھے تو کپتانِ جہاز نے جو غالباً کوئی اٹالین (اٹلی کا باشندہ) تھا، عام مسلمانوں کے اس رجحان کو جسے مولانا کے ساتھ عموماً وہ دیکھ رہا تھا، یہ دریافت کیا کہ یہ کون صاحب ہیں، حجاج میں کوئی انگریزی جاننے والے مسلمان بھی تھے، انہوں نے کپتان سے مولانا کے حالات بیان کئے، اس نے ملنے کی خواہش ظاہر کی، وہاں کیا تھا مولانا بخوشی کپتان سے ملے، کپتان نے اجازت چاہی کہ کیا مذہبی مسائل پر گفتگو کرسکتا ہوں؟ مولانا نے اسے بھی منظور فرمالیا، وہی انگریزی خواں صاحب ترجمان بنے، کپتان پوچھتا تھا اور مولانا جواب دیتے تھے، تھوڑی دیر کے بعد مولانا کے خیالات کو سن کر وہ کچھ مبہوت سا ہوگیا اور مولانا کے ساتھ اس کی گرویدگی اتنی بڑھی کہ قریب تھا کہ اسلام کا اعلان کردے، اس نے شاید وعدہ بھی کیا کہ وہ ہندوستان حضرت سے ملنے کے لئے حاضر ہوگا۔ اس واقعہ کا مولانا محمد قاسم رحمۃ اللہ پر اتنا اثر پڑا کہ آپ نے جہاز ہی پر عزم فرمالیا کہ واپس ہونے کے بعد میں انگریزی زبان خود سیکھوں گا، کیوں کہ مولانا کو یہ محسوس ہو رہا تھا کہ جتنا اثر کپتان پر براہِ راست گفتگو سے پڑسکتا تھا، ترجمان کے ذریعہ وہ بات نہیں حاصل ہورہی ہے لیکن افسوس ہے کہ اجل مسمّٰی نے واپس ہونے کے بعد فرصت نہ دی کاش! یہ صورت پیش آجاتی تو دارالعلوم دیوبند کی علمی تحریک کا رنگ یقیناً کچھ اور ہوتا۔ لوگوں کو اکابر دیوبند کے خیالات سے صحیح واقفیت نہیں ہے ورنہ جن تنگ نظریوں کا الزام ان کی طرف عائد کیا جارہا ہے

ان سے ان کے بزرگوں کی ذات بری تھی۔

حضرت تھانویؒ کا قول

حضرت مولانا قاسمؒ کے نقطۂ نظر کو تو آپ سن چکے، جماعت دیوبند کی آج سب سے بڑی سربرآوردہ ہستی حضرت مولانا اشرف علی تھانوی حکیم الامت مدظلہ العالی کی ہے۔ "النور" میں آپ کے ملفوظات طیبہ شائع ہوتے رہتے ہیں۔ ماہ ربیع الثانی ۱۳۶۱ھ کی اشاعت میں حضرت والا کا ایک بیان گرامی یہ بھی درج ہے:-

"ہم تو جیسا بخاری کے مطالعہ میں اجر سمجھتے ہیں، میر زاہد امور عامہ کے مطالعہ میں بھی ویسا ہی اجر سمجھتے ہیں"

خیال کرنے کی بات ہے، کہاں بخاری اور کہاں معقولات کی کتاب امور عامہ میر زاہد کی، لیکن حکیم الامت کا خیال یہی ہے۔ اس کے بعد اپنے اس خیال کی توجیہ فرماتے ہوئے ارشاد فرمایا "کیوں کہ اس کا شغل بھی اللہ کے واسطے ہے اور اس کا بھی" یعنی اِنَّمَا الْاَعْمَالُ والی بات ہے، جامع ملفوظ نے اس ملفوظ کو درج کرنے کے بعد یہ اضافہ بھی کیا ہے کہ "یہ بات بڑی قوت سے فرمائی"

کیا دیوبند کے جن اکابر کا یہ نقطۂ نظر ہو، اگر بجائے امور عامہ اور صدرا اور شمس بازغہ کے تعریفی اغراض کے لئے جدید علوم و فنون کی کتابیں پڑھائی جائیں یا انگریزی سکھائی جائے تو اسی قاعدہ کی بنیاد پر کہ اس کا شغل بھی اللہ کے واسطے اختیار کیا جائے، ان علوم اور انگریزی زبان یا اسی قسم کی کسی عصری زبان کا سیکھنا اسی طرح باعث اجر نہ ہوگا، جیسے

بخاری کا پڑھنا باعثِ اجر ہے، بلکہ اس زمانہ میں علوم جدیدہ یا مغربی زبانوں کو سیکھ کر چوں کہ اسلام کی خدمت کا موقع امورِ عامہ کے پڑھنے سے زیادہ مل سکتا ہے۔ اس لئے یقیناً اس کا اجر زیادہ ہوگا۔

حضرت شاہ عبدالعزیز اور دیگر زبان

اور واقعہ یہ ہے کہ استاذ اساتذۃ الہند، مسند الدیار الہندیہ فی الحدیث خصوصاً جماعتِ دیوبندیہ کے پیشوائے اعظم حضرت شاہ عبدالعزیز رحمۃ اللہ علیہ کے متعلق جب ان کی ملفوظاتِ طیبہ میں خود ان ہی کی زبانی یہ روایت درج کی گئی ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ عبری (عبرو) زبان کا جاننے والا کوئی فاضل شاہ صاحب کے زمانہ میں دلی آگیا تھا حالانکہ عمر بھی کافی ہو چکی تھی اور خود مرجع انام بنے ہوئے تھے لیکن اس کے باوجود حضرت ارشاد فرماتے ہیں کہ:۔

"فاضلے از اکابر علماء آمدہ از	ایک بڑے فاضل عالم آگئے تو
او تحقیق توریت بلسانِ عبری می کردم"	ان سے توریت کی تحقیق عبرانی
ملفوظاتِ عزیزیہ (ص۲۷)	زبان میں کی۔

جس سے معلوم ہوتا ہے کہ شاہ صاحب نے براہِ راست عبرانی زبان ہی میں تورات اس فاضل سے پڑھی تھی، جامعِ ملفوظات نے یہ بھی نقل کیا ہے کہ:

"چنانچہ چند آیاتِ او (توریت) مع	چنانچہ توریت کی چند آیتیں آپ
ترجمہ ارشاد فرمود (ص۲۷)"	نے پڑھ کر ترجمہ کیا۔

اس آیت کو بھی عربی خط میں جامع نے نقل کیا ہے، لیکن کتاب

اس قدر غلط چھپی ہے کہ امید نہیں الفاظ صحیح ادا ہوئے ہوں۔

بہرحال اس سے اتنا تو معلوم ہوا کہ شاہ صاحبؒ نے عبری زبان سیکھی تھی، پھر جن کے پیشواؤں نے عبری سیکھی تھی اگر ان ہی کے پس روؤں نے انگریزی سیکھنے کا عزم بالجزم حج سے واپسی کے بعد باوجود معمر ہونے کے اگر کر لیا ہو تو کیا تعجب ہے؟ واقعات تو یہ ہیں لیکن اب ان کو کیا کہیے جنہوں نے ان ہی مولویوں کی طرف انگریزی زبان کے سیکھنے کی حرمت کے فتوے کو اس طرح منسوب کیا کہ گویا یہ کوئی واقعہ ہے[1]"

مختصر مدّتی نصاب ——— وقت کی ایک اہم ضرورت

ہمارے مروجہ باضابطہ دینی مدارس کی تعداد ظاہر ہے کہ عصری درسگاہوں کے مقابل بہت محدود اور تھوڑی ہے اور عصری درسگاہوں میں تعلیم حاصل کرنے والی نسل کے مقابلہ میں یہاں تعلیم حاصل کرنے والوں کا تناسب بہت معمولی ہے، اس طرح یہ بات ناگزیر ہوگئی ہے کہ ہم ایک ایسا مختصر مدتی نصاب ترتیب دیں کہ کم سے کم وقت میں فنونِ عالیہ کی بنیادی تعلیم ان کو براہِ راست دین کے اصل ماخذ اور علمائے اسلام کے گنجہائے گراں مایہ سے حاصل ہو۔

اس سلسلہ میں یہ حقیقت پیشِ نظر رکھنی ہوگی کہ اس نصاب میں صرف ان فنون کو جگہ دی جا سکتی ہے جو اسلامیات کے قیمتی عربی ذخیرے کو حل کرنے کے لئے کافی ہیں، جیسے نحو و صرف کے مبادیات اور عربی ادب، نیز وہ فنون جن کا تعلق براہِ راست دین اور شریعت سے ہے جیسے فقہ، تفسیر، حدیث، اصولِ فقہ اور اصولِ تفسیر ——— منطق، فلسفۂ قدیم اور قدیم علمِ کلام، جن میں عام طور پر متکلمین کا خطاب، اعتزال، ارجائیت اور لاادریت کی طرف ہے

[1] "ہندوستان میں مسلمانوں کا نظامِ تعلیم و تربیت" کے اقتباسات ختم

..... ان کو اس نصاب میں جگہ دینا نامناسب ہوگا اور غیر ضروری، نیز ایسے کسی نصاب کی ترتیب کے وقت اس بات کو بھی ملحوظ رکھنا ہوگا کہ ایسی کتابیں داخلِ نصاب کی جائیں جس میں فنی بحثوں سے زیادہ لفظی موشگافیوں اور وقت پسندی سے کام نہ لیا گیا ہو۔ ہم اس سلسلہ میں مناسب سمجھتے ہیں کہ حضرت مولانا محمد یوسف بنوریؒ کے بصیرت افروز اور اہم مقالہ کا ایک اقتباس پیش کرنے پر اکتفا کریں:

"میری ایک خواہش یہ ہے کہ ہمارے مرکزی مدارس میں جہاں علمی نصاب و علمی تحقیقات کے لئے کوشش ہو، اس کے ساتھ ایک ایسا مختصر نصاب ان حضرات کیلئے مقرر کیا جائے جو انگریزی تعلیم سے بقدرِ ضرورت فراغت پا چکے ہیں وہ مدرس عالم بننا نہیں چاہتے۔ بلکہ صرف اپنی دینی ضرورت کے پیشِ نظر قرآن وحدیث واسلامی علوم سے واقفیت حاصل کرنا چاہتے ہیں اس کیلئے زیادہ سے زیادہ ایک سہ سالہ نصاب مقرر کیا جائے، جس میں صرف و نحو، قرآن وحدیث، فقہ وعقائد، اور ادب و تاریخ تک علوم شامل ہوں، انکو پڑھ کر عربی زبان میں بولنے اور لکھنے کی قدرت کے ساتھ اپنی ضرورت پورا کر سکے اور جہاں تک میری معلومات کا تعلق ہے۔ وقت کے اہم تقاضوں میں سے یہ ایک خاص تقاضہ ہے، اور بہت سے قلوب میں یہ تڑپ موجود ہے۔ جہاں اس کا فائدہ یہ ہوگا کہ ایک انگریزی گریجویٹ عالمِ دین بن سکے۔ اس کا ایک اہم فائدہ یہ بھی ہوگا کہ دینی و دینوی تعلیم میں جو خلیج حائل ہے اور فریقین ایک دوسرے سے منسلک خیال میں دو نقطوں پر الگ الگ ہیں ان میں اجتماع کی خوشگوار صورت پیدا ہوگی اور ایک دوسرے

سے قریب ہو جائیں گے اور خیالی وہمی بدگمانیوں میں جو ہر فریق مبتلا ہے یہ اختلاف بھی ختم ہو جائے گا۔" (اقتباس ختم)

راقم الحروف نے دار العلوم سبیل السلام حیدر آباد میں اس کا عملی تجربہ بھی کیا ہے اور مذکورہ دار العلوم میں ایسی مختصر مدتی درس گاہوں کی داغ بیل ڈالی گئی ہے جن کے بارے میں یہ بات کہی جا سکتی ہے کہ وہ ایک خوش گوار اور حوصلہ افزا تجربہ ہے بلکہ شاید یہ کہنا بیجا نہ ہوگا کہ اس کی افادیت ہمارے مدارس کے متداول طویل مدتی نصاب سے کسی طرح کم نہیں ہے بلکہ ایک گونہ زائد ہی ہے۔ کیونکہ اس میں شریک ہونے والے طلبہ اپنے ذوق وشوق کے ساتھ شریک ہوتے ہیں۔ ان کے اندر ذاتی طلب اور جستجو ہوتی ہے شعور کی پختگی اور ذہنی بیداری ہوتی ہے۔ اس لئے نصاب کو قابلیت وصلاحیت سے پڑھ کر اس میں درک وکمال پیدا کرنے کی پوری کوشش کرتے ہیں۔

یہاں یہ بھی واضح رہے کہ اس مختصر مدتی نصاب کی اہمیت وافادیت حضرت حکیم الامت مولانا اشرف علی تھانویؒ پر بھی روشن تھی اور انہوں نے "ضمان التکمیل فی زمان التعجیل" کے نام سے ایک نصاب بھی مرتب فرمایا تھا۔ شاید آپ کو یہ معلوم کر کے تعجب ہو کہ نامور محقق عالم مولانا ظفر احمد تھانویؒ اسی نصاب کے فارغ شدہ تھے۔ مولانا مفتی محمد شفیع صاحبؒ نے بھی کراچی میں اس نصاب کو جاری فرمایا تھا جو اب بھی خوبی کے ساتھ چل رہا ہے۔ اسی کے ساتھ اہم دینی مدارس ایک متعینہ مدت کے لئے بزبانِ اُردو دینی کتب پر مشتمل مراسلاتی کورس کا نظام جاری کریں تو مستند طریقہ پر بنیادی دینی تعلیم کو کافی فروغ ملے گا اور عصری درسگاہوں کے طلبہ اور مختلف مصروفات سے وابستہ عام مسلمانوں کو بڑا دینی نفع ہوگا بعض اہم ادارے اس کام کو انجام دے رہے ہیں، بلاشبہ ان کا یہ کام قابلِ تحسین بھی ہے۔ اور لائقِ تقلید بھی۔

طرزِ تدریس کی خامیاں

تعلیم کی افادیت میں بعض حیثیت سے نصابِ تعلیم سے زیادہ "طرزِ تعلیم" اور مدرسین کی اپنی تعلیمی صلاحیتوں کو دخل ہے۔ نصابِ تعلیم کے بذاتہٖ بہت مفید اور مناسب ہونے کے باوجود اگر پڑھانے والے نے صحیح طریق کار نہیں اپنایا تو طلبہ کو اس سے کوئی فائدہ نہیں پہونچے گا۔ "جدید چیلنج" کے مقابلہ کے لئے جہاں نصابِ تعلیم میں ترمیم کی ضرورت ہے۔ وہیں اس سے بڑھ کر طرزِ تعلیم میں سدھار اور لائق نیز نئے مسائل سے واقف اساتذہ کی ٹیم تیار کرنے کی ضرورت ہے۔

آج ہمارے مدارس کا حال یہ ہے کہ "کبریٰ" سے لے کر "ملا حسن" تک زبردست مغز سوزی کے باوجود منطقی فصول واجناس اور اشکال اور قضایا "کل انسان حیوانٌ ناطق" اور اس قسم کی چند متعین مثالوں سے آگے بڑھ ہی نہ سکے۔ اساتذہ کی پوری تقریر انہیں چند انگلیوں پر گن لی جانے والی مثالوں کے گرد گھومتی رہتی ہے۔ یہ حال ایک فن کا نہیں کم وبیش تمام فنون کا ہے حالانکہ ضرورت اس بات کی ہے کہ اسباق میں تقریر کم ہو اور مشق وتمرین زیادہ ہو۔

اونچی جماعتوں میں رواج ہے کہ ابتدا میں بلاوجہ طویل تقریریں ہوتی ہیں مثلاً یہ کہ مصنف نے شروع میں خطبہ کیوں نہیں لکھا' اس کے اتنے جوابات ہیں اور مصنف نے فلاں بحث کے بجائے فلاں بحث سے کتاب کیوں شروع کی۔ اس پر یہ اور یہ اعتراضات وارد ہوتے ہیں اور اس کے فلاں جواب ہیں' پھر جب "کتابیں" ذرا تیز رفتاری سے پڑھائی جانے لگیں تو حال یہ ہوتا ہے کہ طالبِ علم نے صرف عبارت پڑھ لی اور بس' اس کے بعد عبارت کا ترجمہ' عبارت حل کرنا' مطلب سمجھانا' سارا کام استاذ کا ہے' نہ پڑھنے والوں کو کبھی کوئی اشکال ہوا۔ اور نہ استاذ نے اس طرف توجہ دلانے کی ضرورت محسوس

کی، اور اگر خوش قسمتی سے اساتذہ باصلاحیت ہیں اور مطالعہ کا ذوق رکھتے ہیں تو خود ہی تمام مالہٗ وماعلیہ کہہ سنایا۔ طالبِ علم کے لئے مطالعہ اور جستجو کا کوئی موقع ہی نہیں چھوڑا گیا اس طرح علم کی وہ حقیقت کہ نظر و فکر اور معلومات کی مدد سے "مجہولات" کو حاصل کیا جائے ختم ہو کر رہ گئی۔ اس طرزِ تعلیم کی وجہ سے طلبہ کا دماغ مفلوج ہو کر رہ جاتا ہے، اور وہ پکی پکائی روٹی کھانے کے ایسے خوگر ہو جاتے ہیں کہ خود ذہن پر زور ڈالنا اور استاذ کی تقریر کے بغیر مطالعہ سے کتابیں حاصل کرنا ان کے لئے ممکن نہیں ہوتا۔ مولانا سید مناظر احسن گیلانی مرحوم نے اسی طرزِ تعلیم کو "گونگے درس" کا نام دیا ہے۔ اور اس سے بھی افسوس ناک حالت اس وقت ہوتی ہے جب شروع کی طویل تقریروں کے نتیجہ میں کتاب صرف چوتھائی حصہ ہو پاتی ہے کہ سال اپنی آخری سانس لینے کو تیار رہتا ہے، اب تو افہام و تفہیم کی نہ کوئی گنجائش رہتی ہے اور نہ ضرورت محسوس کی جاتی ہے۔ اکثر و بیشتر خود اساتذہ ہی عبارتیں بھی پڑھ دیا کرتے ہیں اور اسی پر اکتفا کیا جاتا ہے۔ ضرورت اس بات کی ہے کہ قدیم طرزِ تعلیم کے مطابق زیادہ سے زیادہ خود طلبہ سے عبارتیں حل کرائی جائیں، ان کے اندر مطالعہ کا ذوق پیدا کیا جائے اور ہر سال اس سال کی کتابوں کو پیشِ نظر رکھتے ہوئے دو ایک کتاب مطالعہ کے لئے رکھی جائیں اور اس کو اتنی ہی اہمیت حاصل ہو جتنی دوسری درسی کتابوں کو، جب تک تعلیم کے ساتھ مطالعہ، کتب بینی اور حل عبارت کی ایسی صلاحیت اور ذوق پیدا نہیں ہو جاتا تعلیم کا معیار بلند نہیں ہو سکتا۔

پھر جس طرح اساتذہ قدیم فرق باطلہ اور ان کے نظریات کی تردید کرتے ہیں، اور ان پر عقلی اور نقلی دلائل کی روشنی میں تنقید کرتے ہیں یا جس طرح فقہی اصول و کلیات کی روشنی میں متقدمین کی کتابوں میں لکھے ہوئے فروعی مسائل کی نشاندہی کرتے ہیں۔ اس دور کے فرقِ باطلہ، جدید نظریات اور اس دور میں پیدا ہونے والے فقہی مسائل پر روشنی ڈالنے کی کوئی ضرورت نہیں محسوس کرتے۔ حالانکہ عصری

تقاضوں کے پیشِ نظر ان کی اہمیت زیادہ ہے۔

طرزِ تدریس کی یہ خامیاں جواب "روایت" بن چکی ہے اور اساتذہ کے کی کھیپ اسی رنگ میں رنگ چکی ہے، کی اصلاح کیلئے ضروری ہے کہ اساتذہ کو اس کی باضابطہ تربیت دی جائے اور ہونہار طلبہ پر توجہ دیکر ان پر شروع ہی سے ایسی محنت کی جائے کہ اساتذہ اور معلمین کی اچھی کھیپ تیار ہوسکے۔

نظامِ تعلیم ۔ اصلاح کی ضرورت

ہم اس عنوان کے تحت خود کچھ لکھنے کے بجائے مولانا محمد یوسف بنوریؒ کی قیمتی اور فکر انگیز باتیں ان کے ایک مقالہ سے پیش کرنا چاہتے ہیں۔ امید کہ اہل مدارس ان باتوں پر سنجیدگی سے غور کریں گے۔

مولانا تحریر فرماتے ہیں:

"مدارس عربیہ کا نصابِ تعلیم جس طرح محتاج اصلاح ہے اس سے کہیں زیادہ نظامِ تعلیم کی اصلاح کی حاجت ہے۔ نظامِ تعلیم سے میری مراد ایک وسیع مفہوم ہے۔ جس میں طلباء کی تربیت و نگرانی، طلباء کا علمی معیار، تدریس و مطالعہ کا طریقہ، کن کن مضامین پر زیادہ توجہ دینے کی ضرورت ہے۔ طلباء کی ذہنی تربیت کے لئے کیا کیا ذرائع اختیار کئے جائیں، طلباء میں علمی استعداد پیدا کرنے کے لئے ترغیب و ترہیب کے کیا کیا وسائل ہونے چاہئیں، غرض اصلاح و تقویٰ، علمی معیاری قابلیت، اخلاص و عمل کی روح کے پیدا کرنے کے لئے کن کن تدابیر کو کام میں لایا جائے۔ جب تک طلباء کے قلوب میں امراض نہیں تھے۔ دماغوں میں جدوجہد کا جذبہ موجود تھا طبیعتیں علمی مسابقت سے سرشار تھیں۔ اساتذہ میں اخلاص و تعلق مع اللہ کی روح جلوہ گر تھی اور تعلیم و تعلم دونوں کا مقصد خدمتِ علم و خدمتِ دین تھا یا کم از کم حصولِ علم صحیح، تو ان تدابیر کی

حاجت نہیں تھی لیکن نقطۂ خیال بدل گیا تعلیم کا مقصد حصولِ سند ہے یا حصولِ ملازمت اساتذہ میں وہ روح نہ رہی۔ ان کا مقصد مشاہرہ کا حصول یا مہتمم کو خوش کرنا یا پھر طلباء سے خراجِ تحسین کی سند حاصل کرنا۔ جب یہ امراض پیدا ہوں گے تو اب ضرورت ہے کہ انتہائی دل سوزی اور جانفشانی کے ساتھ اس کے علاج کی طرف توجہ کرنی چاہیئے۔ سابق الذکر امور میں سے ہر ایک کافی تفصیل طلب ہے لیکن یہاں چند اہم ترین امور کی اصلاحی تدابیر کا اجمالی خاکہ پیش کرنا ہے:

○ مدرسین حضرات کا طریقۂ تدریس یہ ہونا چاہیئے کہ کتاب کی مشکلات کو سادہ الفاظ میں اور اختصار کے ساتھ حل کرنے کی کوشش کریں۔ تعبیر کیلئے عمدہ دل نشیں واضح طریقہ اختیار کریں۔ کتاب کے حل کرنے میں قطعاً تساہل سے کام نہ لیا جائے۔ حل کتاب کے بعد فن کی مہمات پر طلباء کو متوجہ کیا جائے۔ جس مشکل کی تحقیق کسی نے عمدہ کی ہے۔ ان کا حوالہ دیا جائے اور طلباء کو ان ماخذ سے روشناس کرایا جائے تاکہ مستعد ذہین طلباء اپنی معلومات کو آگے بڑھا سکیں، فضول و بے کار مباحث میں طویل طویل تقریریں کر کے طلباء سے دادِ تحقیق حاصل کرنا، یہ تدریس کا سب سے بڑا فتنہ ہے۔ اس کو کسی نہ کسی طریقہ سے ختم کرنا چاہیے۔

○ جو کتابیں ایسی ہیں جن کا ختم کرنا ضروری ہے پوری توجہ کرنی چاہیے کہ کتاب ختم ہو جائے، کوئی بحث نہ رہ جائے جب تک کتاب ختم نہ ہو اس کا امتحان نہ لیا جائے تاکہ اختتام امتحان سالانہ موخر کیا جائے اور اس مشکل پر قابو پانے کیلئے کتابوں کو تین حصوں پر تقسیم کرنا چاہیئے کہ سہ ماہی، شش ماہی، سالانہ امتحان تک کہاں سے کہاں تک پہونچ جانا چاہیئے۔ اس کا شدت سے انتظام کیا جائے۔ ایسا نہ ہو کہ ابتداء میں ماہ دو ماہ بڑی بڑی تقریریں ہوں اور آخر میں ورق گردانی، جس نے علم کی ریڑھ کی ہڈی توڑ دی۔

○ جو اساتذہ جن کتابوں کیلئے زیادہ موزوں ہوں، علمی استعداد اور طبعی رجحانات کے اعتبار سے تقسیم اسباق میں اس کا خیال ضرور رکھا جائے۔

○ ابتدائی دو سال کی تعلیم میں نتائج امتحانات میں نہایت سختی کی جائے۔ ناکامیاب کو قطعاً کسی مراعات کی بنا پر کامیاب نہ بنایا جائے۔

وسط اور انتہائی تعلیم میں معقول اعذار کی بنا پر تسامح قابلِ برداشت ہے لیکن ابتدائی تعلیم میں ہرگز ایسا نہ کیا جائے۔

○ ابتدائی تعلیم اچھے اور تجربہ کار اساتذہ کے حوالہ کرنی چاہیئے جو مسائل کو عمدہ اور مفید ترین طریقہ پر ذہن نشین کرنے کی قابلیت رکھتے ہوں۔ الغرض ابتدائی تعلیم کی عمدگی و پختگی پر بے انتہا توجہ کی ضرورت ہے۔ اگر اعلیٰ تعلیم کے اساتذہ کو ابتدائی درجہ کا کوئی سبق بھی دیا جائے تو اس میں بہت فوائد و مصالح ہیں۔

○ مدرسین کو اسباق اتنے دیئے جائیں کہ وہ مطالعہ و تدریس کی ذمہ داری پر صحیح طریقے سے عہدہ برآ ہو سکیں، جسکا اجمالاً اندازہ یہ لگایا جا سکتا ہے۔

ابتدائی درجہ کے اساتذہ کے پاس زیادہ سے زیادہ پانچ گھنٹے تعلیم کے لئے ہوں۔ متوسط درجات کیلئے چار گھنٹے آخری درجات کے لئے تین گھنٹے۔

○ اساتذہ ایسے رکھے جائیں جو ہمہ تن مدرسہ سے وابستہ ہوں، ایسا نہ ہو کہ صرف دو تین گھنٹے کا رسمی تعلق ہو یا کہیں اور ملازم ہوں مدرسہ کے مصالح کے پیش نظر یہ صورت بہت اہم اور قابل توجہ ہے۔

○ اساتذہ کے انتخاب میں حسب ذیل امور معیار انتخاب ہوں:

اخلاص و تقویٰ، صلاح و اعلیٰ قابلیت اور اس فن سے مناسبت جو اس کو حوالہ ہو۔ مدرسہ کے نظام سے وابستگی اور طلباء کے تعلیمی و اخلاقی معیار کو بلند کرنے کا جذبہ، تدریس کا شوق، یہ سب باتیں بہت اہم ہیں، ان میں سے کسی ایک بات کی بھی کمی ہو تو صحیح کام نہ ہو سکے گا۔

○ اساتذہ کو فن کی اعلیٰ کتابوں کی طرف مراجعت کرنی چاہیے تاکہ عمدہ معلومات طلباء کیلئے فراہم کرسکیں۔ الغرض مطالعہ و جدوجہد ضروری ہے۔ تن آسانی و راحت کوشی سے صرف سابقہ معلومات پر اکتفا نہ کرنا چاہئے۔ طلباء کے اندر اعلیٰ علمی معیار پیدا کرنے کے لئے یہ ضروری ہوگا کہ اساتذہ اس کے معیار کے ہوں۔

○ جہاں تک مقدرت ہو طلباء کو راحت و آسائش پہونچائی جائے۔ اور طلباء اتنے رکھے جائیں جن کی عمدہ خدمت ہوسکے لیکن اس کے ساتھ ان کی علمی نگرانی درس میں حاضری، رات کا مطالعہ، امتحان میں سختی۔ ان سب باتوں میں کوئی رعایت یا مسامحت نہ اختیار کی جائے، باقاعدہ طلباء کے احوال کا تفقد رکھا جائے اور اس کے لئے انتظام ہو۔ اگر کوئی طالب علم سہ ماہی میں ناکام ہو تو اس کا کھانا بند کر دیا جائے، اور اگر ششماہی میں بھی ناکام ہو تو آخر سال تک مزید موقع دیا جائے۔ اگر سالانہ امتحان میں بھی نتیجہ ساقط رہا تو اس کو علیحدہ کر دیا جائے۔ ان امور میں تسامح و مراعات کرنا علم کو دفن کرنے کے مترادف ہے۔

○ ابتدائی درجۂ عربی کے طلباء کا ماہانہ امتحان لازمی قرار دیا جائے۔ مقدار خواندگی متعین کی جائے۔ کوشش ہو کہ اس حد تک کتاب پہونچ جایا کرے۔

○ ہر درجہ کے مناسب مطالعہ کے لئے کوئی نہ کوئی کتاب منتخب کر کے متعلم کو دی جائے۔ اس کتاب کا امتحان سالانہ لازمی قرار دیا جائے۔

○ طلباء کی اخلاقی نگرانی، عادات کی اصلاح، دینی وضع کی پابندی بے حد ضروری ہے۔ باجماعت نماز کی پابندی، سیرت و صورت کی تربیت و اصلاح کی طرف پوری توجہ ہونی چاہیئے۔ ان امور میں تسامح سم قاتل ہے۔ غبی ذکی طالب علم اگر محنتی و صالح ہو تو اس کو برداشت کیا جاسکتا ہے، لیکن ذکی، بدشوق و بداطوار ہرگز رعایت کے مستحق نہیں۔

○ مدرسہ کے ضوابط ایسے ہوں کہ طلبار خود بخود دینی وضع یا لحن کے شعار، لباس، پوشاک، خورد و نوش، معاشرت و عبادت میں پابند ہو جائیں۔

○ امتحانات میں مسابقت و تقدم کے لئے ترغیبی وظائف رکھے جائیں۔ سالانہ امتحان میں اعلیٰ کامیابی پر انعامات مقرر کئے جائیں۔ انعامات میں بجائے نقد رقوم کے عمدہ عمدہ کتابیں دی جائیں، اگر انعامی کتاب میں ان کی علمی استطاعت و طبعی خصوصیات کی رعایت رکھی جائے تو اور سونے پر سہاگہ کا کام دے گی۔ مثلاً حدیث میں اعلیٰ کامیابی پر حدیث کی کوئی عمدہ کتاب، تفسیر میں اعلیٰ کامیابی پر تفسیر کی اعلیٰ کتاب دیجائے۔

○ ہر سال کے امتحانات میں ایک پرچہ امتحان کا ایسا ہو جس سے عام اہلیت و قابلیت و علمی استعداد کا پتہ چلے۔ کسی خاص کتاب سے تعلق نہ ہو۔ آخری فراغتِ علوم کے امتحان میں یہ تشخیص بہت ضروری سمجھی جائے۔

○ عربی ادبی زبان کی قابلیت، مقاصد تعلیم میں شامل کرنی چاہیئے ابتدا سے عربی انشار نویسی کی مشق و تمرین کا سلسلہ جاری رکھنا چاہیئے۔ ایک گھنٹہ مخصوص تحریر عربی کا ہو، جو ہر درجہ میں لازمی ہو۔ تین سال تعلیم حاصل کرنے کے بعد چوتھی جماعت میں تدریس کی زبان عربی ہو۔ مدرس عربی میں پڑھائے، طلبار و اساتذہ کے سوالات و جوابات کا سلسلہ بھی عربی میں ہونا چاہیئے۔

○ طلبار میں عربی ادبی ذوق پیدا کرنے کے لئے عربی مجلات و صحف و جرائد کا اجرا لازمی ہے اور ایک دار المطالعہ کا قیام اس مقصد کیلئے ضروری ہے۔

○ طلبار میں تقریر و خطابت کی روح پیدا کرنے کیلئے ہفتہ وار جمعہ کی رات تقریر کرنے کے لئے مجلسیں قائم کی جائیں۔ ہر درجہ کے طلبار کے لئے علیحدہ مجلس تربیت ہو، اور ہر ایک مجلس کی نگرانی و تربیت ایک استاد کے سپرد ہو۔ آخری تقریر اس استاد کی ہو

ہر جلسہ کے لئے تقریر کا موضوع متعین ہو، اور آخری استاد کی تقریر تقاریر پر تنقید و تبصرہ ہو۔ ہر ہفتہ وار مجلس کا وقت کم از کم تین گھنٹے ہو۔

مدرسہ میں طلباء کی تکثیر جماعت و تکثیر افراد کی کوشش نہ کرنی چاہیئے کیت قابل التفات نہ ہو، کیفیت پر توجہ مرکوز رکھی جائے۔ مستعدین کی قلیل جماعت، غیر مستعد نااہل کے جم غفیر سے زیادہ قابل قدر سمجھی جائے۔ ارباب مدارس کو تکثیر تعداد کے تناسب سے بے حد نقصان پہونچا ہے۔ دس صحیح طالب علموں پر سالانہ بیس ہزار کا خرچ قابل برداشت ہونا چاہیئے۔ لیکن سو نااہل طلباء پر بیس ہزار کا خرچ بھی قابل مواخذہ ہے۔ الغرض خطرناک وبا کی شکل میں مدارس عربیہ دینیہ میں یہ مرض پیدا ہوگیا۔ اس کے علاج و تدارک کی طرف پوری توجہ کی ضرورت ہے۔

نظام تعلیم میں عوام کو مدرسہ کی امداد پر مائل کرنے کے بجائے علم و دین کی خیر خواہی مقدم ہونی چاہیئے۔

خالق کی رضا مخلوق کی رضا سے مقدم ہونی چاہیئے۔ مخلوق کی رضا مندی کی کوشش سے اور حق تعالیٰ کی رضا جوئی سے غفلت کے نتائج دینی و دنیاوی خسران ہے۔"

(ماہنامہ الفرقان بابت ماہ فروری و مارچ ۱۹۷۵ء صفحہ ۷۰ تا ۷۷)

دردمندانہ شکایت ۔ ہمدردانہ پیغام

اس میں کوئی شک نہیں کہ ہندوستان میں خصوصاً آزادی کے بعد، دینی مدارس نے دین کے تحفظ و بقا اور ترویج و اشاعت کے لئے بڑا اونچا کام کیا ہے۔ وقت اور حالات کے لحاظ سے گذشتہ صفحات میں جو مشورے دیئے گئے ہیں، اور مختلف تجاویز سامنے لائی گئی ہیں۔ وہ دراصل خوب سے خوب تر کی تلاش کی طرف ایک قدم ہے۔ اسی ذیل میں ایک بات مشہور صاحب قلم مولانا تقی عثمانی ایڈیٹر البلاغ

کراچی (ابن مولانا مفتی محمد شفیع صاحبؒ) کی ہے جس میں دردمندانہ شکایت کے ساتھ ہمدردانہ پیغام ہے۔ یہ پیغام اس لائق ہے کہ دینی مدارس کے اساتذہ طلبہ اور منتظمین و معاونین نظر کی راہ سے دل میں اتار لیں۔ اور اس کی روح پر علی الفور بھرپور توجہ دیں۔ مولانا عثمانی لکھتے ہیں:

"علوم دین کی تدریس درحقیقت دعوتِ دین کا ایک اہم شعبہ ہے۔ اور اسی کے ذریعہ ایسی شخصیات ابھر سکتی ہیں جنہیں صحیح معنیٰ میں دین کا داعی کہا جاسکے اسی لئے ایک مدت تک علماء کا یہ خیال رہا ہے کہ تعلیم دین پر اجرت کا لین دین جائز نہیں لیکن جب متاخرین نے یہ دیکھا کہ دین کی تدریس و تعلیم ایسا کام ہے کہ اُسے خاطر خواہ طریقے سے انجام دینے کے لئے پورا وقت وقف کرنا ضروری ہے۔ اس لئے جب تک ایک طبقے کا معاش بھی اسی تعلیم و تدریس کے ساتھ وابستہ نہ کیا جائیگا، اسلامی علوم کی کما حقہٗ حفاظت ممکن نہیں تو آخر زمانے کے علماء نے یہ فتویٰ دے دیا کہ جو شخص اپنے تمام اوقات اس کام میں صرف کرتا ہو، اور اسے اس کی وجہ سے دوسرے وسائل معاش سے استفادہ کا موقع نہ ملتا ہو وہ اپنے اوقات کا معاوضہ لے سکتا ہے۔

اس کے نتیجہ میں منظم دینی درس گاہیں وجود میں آئیں، اور ملت کے ایک بڑے طبقے نے تحصیل معاش کی طرف سے بے فکر ہو کر اپنی ساری توانائیاں اس کام میں صرف کر دیں، لیکن یہ بات اس راہ کا ہر مسافر جانتا تھا کہ اس راستے میں معاش ایک ضرورت ہے، مقصد نہیں، اس کا اصل مقصد دین کی خدمت افراد کی تعلیم و تربیت اور اسلامی تعلیمات کی نشر و اشاعت ہی تھی۔ فکر و عمل کی ساری توانائیاں اسی کے لئے وقف تھیں، دل میں اسی مقصد کی لگن اور اسی کا جذبہ جاری و ساری تھا اور دنیا کی مزید لالچ اُسے اپنے اصل مقصد سے دور نہیں کر سکتی تھی۔

جن لوگوں نے اس طرح دینی مدارس قائم کئے یا ان میں تدریس کی خدمات انجام دیں ان کے نزدیک تنخواہ، معاشی ترقی اور دُنیوی منافع کے مسائل بالکل ثانوی حیثیت رکھتے تھے۔ ان کی اصل توجہ اس طرف تھی کہ وہ سراپا تبلیغ و دعوت بن کر اپنے ہر ہر قول و فعل سے اپنے زیر تربیت افراد کو مثالی مسلمان بنائیں، انہیں علمِ صحیح کی دولت سے مالا مال کریں، ان کے اعمال و اخلاق سنواریں، ان میں ایک داعیٔ دین کی روح پھونکیں اور ان کے سینوں میں اللہ کے لئے جینے اور مرنے کا جذبہ بدرجۂ کوٹ کوٹ کر بھر دیں۔

یہ درس گاہیں درحقیقت صرف کتابی تعلیم گاہیں نہیں تھیں بلکہ عملی اور اخلاقی تربیت کی خانقاہیں بھی تھیں، دارالعلوم دیوبند کو اللہ نے جو غیر معمولی امتیاز بخشا اس کی اصل وجہ یہی تھی کہ وہ ایک رسمی درسگاہ نہیں تھی جس میں طلباء کو نرا علم پڑھایا جاتا ہو، اس کے بجائے وہ ایک ایسی تربیت گاہ تھی جس میں مسلمان داعی تیار کئے جاتے تھے۔ اس کے عملے کا ہر ہر فرد اسی مقصد کی لگن سے سرشار تھا، اور اسی لگن نے ایسی شخصیتیں پیدا کر دیں جنھوں نے برصغیر کی تاریخ کا رُخ موڑ کر رکھ دیا۔

لیکن رفتہ رفتہ ان درس گاہوں سے اصل مقصد کی وہ لگن کم ہوتی چلی گئی، ترجیحات کی ترتیب اُلٹ گئی، خدمتِ دین کا جذبہ کمزور پڑ گیا، استاد اور شاگرد کے درمیان ایک خشک اور کھردرا رسمی تعلق باقی رہ گیا، اعمال و اخلاق کی تربیت مقاصد کی فہرست سے خارج ہو گئی، یہاں تک تعلیم و تعلم محض ایک رسم بن کر رہ گیا جس کے اصل مقاصد سے استاد اور شاگرد دونوں غافل ہیں۔

چند گراں قدر مستثنیات کو چھوڑ کر، اس وقت ہماری کیفیت یہ ہے کہ دین کی تعلیم و تدریس ہمارے نزدیک دوسرے پیشوں کی طرح ایک پیشہ بن چکی ہے

جس کا اصل مقصد حصولِ معاش ہے اور ثانوی مقصد خدمتِ دین، استاد ایک معین وقت میں درس گاہ پہنچتا ہے۔ اور گھنٹے بھر کی ڈیوٹی ادا کر کے چلا آتا ہے۔ طلباء کس حال میں ہیں؟ ان کی تعلیمی قابلیت کیوں کمزور ہو رہی ہے؟ ان کے اخلاق کیوں خراب ہو رہے ہیں؟ ان کی اصلاح کی کیا صورت ہے؟ یہ سب سوالات ایسے ہیں جن پر سوچنا استاد کے فرائض سے خارج ہو چکا ہے۔

جب استاد کو طلباء کی تعلیمی استعداد ہی کی کوئی فکر نہیں ہے تو وہ ان کے اعمال و اخلاق کی طرف توجہ کیا دے گا؟ رہا، انہیں دعوتِ دین کی تربیت دینا اور ان میں دین کے لئے قربانی دینے کا جذبہ اُبھارنا، سو یہ تو بہت ہی دور کی چیز ہے، اس پہلو پر سوچنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔

ان حالات میں جو لوگ ہمارے ہاتھوں قوم کے رہنما بننے کے لئے تیار ہوں گے، اندازہ کیا جاسکتا ہے کہ ان میں دینی رہنمائی کی کتنی صلاحیت ہوگی؟ وہ کیسی دعوت اور کیسی تبلیغ کر سکیں گے؟ اور ان کی دعوت و تبلیغ کس حد تک موثر ہو سکے گی؟

اسلام کبھی رسمی جماعتوں اور انجمنوں سے نہیں پھیلا، وہ زیادہ تر افراد کے کردار و عمل سے پھیلا ہے۔ اگر ہمارے یہاں افراد تیار نہیں ہو رہے، اگر ہماری درس گاہیں بانجھ ہو رہی ہیں اور ان میں شخصیتوں کی تعمیر کا کام بند ہو چکا ہے تو آپ ہزار جماعتیں بنا لیجئے، لاکھ کتابیں لکھ ڈالئے، آپ کی دعوت و تبلیغ کبھی مؤثر نہیں ہو سکتی، اس لئے اس وقت کی سب سے اہم ضرورت یہ ہے کہ ہم اپنے تعلیم و تربیت کے نظام پر نظرِ ثانی کر کے اس کے جسدِ مردہ میں نئی روح پھونکنے کی کوشش کریں۔

آج کل دینی مدارس کے نصاب میں ترمیم کی صدائیں بار بار بلند ہوتی

رہتی ہیں، اور اس میں کوئی شک نہیں کہ بحالاتِ موجودہ یہ نصاب بھی ضروری ترمیم و اضافہ کا متقاضی ہو چکا ہے لیکن ہماری نظر میں اس سے کہیں زیادہ ضرورت اس بات کی ہے کہ دینی مدارس کے ماحول میں اس جذبہ کو دوبارہ بیدار کیا جائے جس کے تحت یہ درس گاہیں قائم ہوئی تھیں اور جو اب مرورِ ایام سے سرد پڑ چکا ہے بنیادی ضرورت اس کی ہے کہ ہم میں اپنے مقصدِ زندگی کی نہ مٹنے والی لگن پیدا ہو، ہم تعلیم و تدریس کے فرائض پیشے کے طور پر نہیں زندگی کے عزیز ترین مشن کے طور پر انجام دیں۔ اور اپنے فکر و عمل کی تمام طاقتیں اس کام میں صرف کریں کہ زیرِ تعلیم و تربیت افراد صحیح معنی میں مسلمان، عالم دین اور داعی و مبلغ بن سکیں، اگر یہ نہیں ہوتا تو بہتر سے بہتر نصاب بھی حالات میں خوش گوار تبدیلی نہیں لا سکتا۔ حقیقت یہ ہے کہ جو جماعت اپنے آپ کو علم دین کے لئے وقف کرے ان کا کام صرف پڑھنا پڑھانا یا سمجھانا ہی نہیں بلکہ قرآنی ارشاد کے مطابق اس کی پوری زندگی کے صرف دو مقصد ہیں۔ یہی ان درسگاہوں کا مکمل نصاب ہے جس کو قرآنِ کریم نے دو لفظوں میں بیان فرمایا لیتفقھوا فی الدین ولینذروا قومھم جس کا حاصل دو چیزیں ہیں، اوّل دین کی سمجھ بوجھ پیدا کرنا جس میں صرف کتابوں کا سمجھ لینا کافی نہیں، بلکہ ان کے مقتضیٰ پر عمل اور اپنے اعمال و اخلاق میں دینی رنگ بھرنا بھی شامل ہے۔ حضرت حسن بصریؒ نے تفقہ فی الدین کی یہی تفسیر بیان فرمائی ہے دوسرے قوم کو مشفقانہ انداز یعنی دعوت و تبلیغ کے ذریعہ ان کو علمِ صحیح اور عملِ مستقیم کی ھدایت دینا اور اس کے اعمال و اخلاق کی اصلاح کرنا مگر افسوس ہے کہ عرصۂ دراز سے ہماری درس گاہیں ان قرآنی مقاصد کو بھلا بیٹھی ہیں، اسی کا نتیجہ ہے جو کچھ ہم دیکھ رہے ہیں۔ اس لئے ضرورت ہے کہ ہم اس کی طرف بھرپور توجہ کریں۔ اور اس سلسلہ میں درسگاہوں کی دو بابت ایک تجدیدی انقلاب برپا کریں

(عصرِ حاضر میں اسلام کیسے نافذ ہو ص ۳۲۲ تا ۳۲۴)

بنیادی دینی تعلیم کی اہمیت

اسلام میں یہ مقصود و مطلوب نہیں ہے کہ ہر مسلمان دین کا تفصیلی اور تحقیقی علم حاصل کرے، یہ فرض کفایہ ہے۔ یعنی ہر بستی اور آبادی میں ایسے تحقیقی علم رکھنے والے چند علماء و فضلا ہوں تو کافی ہے۔ البتہ یہ ضرور مقصود و مطلوب ہے کہ ہر مسلمان دین کی ضروری اور بنیادی تعلیمات و احکام سے باخبر ہو یہ فرض عین ہے۔ یعنی فرداً فرداً ہر شخص کو اتنا علم رکھنا ضروری ہے، ورنہ اللہ تعالیٰ کے یہاں سخت باز پرس ہوگی۔

اسلام میں بنیادی و ضروری دینی تعلیم پر جتنا زور دیا گیا ہے اس سے عام طور پر مسلمان واقف ہیں، یہ زور اس لئے دیا گیا ہے کہ اس سے اسلامی معتقدات محفوظ رہیں، عبادات کا تصور مضبوط رہے اور اسلامی اعمال و اخلاق کی بجا آوری میں قوت اور مستعدی رہے۔ اور غیر اسلامی نظریات اور رسوم و رواج سے دوری رہے۔ اس لئے ہر زمانہ میں مسلم معاشرے میں بنیادی دینی تعلیم کی اہمیت شدت کے ساتھ محسوس کی جاتی رہی ہے۔ حالتِ ایمان میں زندہ رہنے اور اسی حالت میں دنیا سے جانے کی فکر انبیاء اور سلف و صالحین کو ہمیشہ رہی ہے، بقول امیر: ؎

کچھ رہے یا نہ رہے، پر یہ تمنا ہے امیر
آخری وقت سلامت میرا ایمان رہے

یہ زمانہ جو الحاد و دہریت اور اخلاقی آوارگی کا ہے۔ سرکاری سطح پر بھی مذہبی تعلیم کا کوئی نظم نہیں، بلکہ سرکاری نصاب تعلیم سے تو اکثر حالت میں مذہب کے خلاف بغاوت کا ذہن پیدا ہوتا ہے۔ اس لئے نہایت ضروری

ہے کہ عام مسلمان اپنی اپنی بستیوں، محلّوں اور مسجدوں میں مکاتب و مدارس صحیح نظم وضبط کے ساتھ قائم کریں، اور جہاں قائم ہیں ان کا ہر حیثیت سے تعاون کریں۔ اور ان مکاتب و مدارس کا کام اس انداز میں نہ ہو کہ گویا یہ زندگی کا کوئی ثانوی کام ہے بلکہ اس کام کو اس زندہ احساس کے ساتھ کرنا ہوگا کہ یہ ہماری زندگی اور موت کا معاملہ ہے۔ مفسرین نے قرآن حکیم "لا تقتلوا اولادکم" کے تحت لکھا ہے کہ اولاد کا جسمانی قتل ہے ہی، اس کے ساتھ اولاد کو دین سے بے بہرہ اور ناآشنا رکھنا "روحانی قتل" ہے۔ اور سنگینی میں جسمانی قتل سے بڑھا ہوا ہے، لڑکیوں کی دینی تعلیم کا بھی خصوصی نظم ہونا چاہئے، اور ان کے لئے مستقل دینی ادارے قائم ہونے چاہئیں جن سے غفلت ایک "اجتماعی جرم" ہے جن بستیوں میں مسلمانوں کے گھر دو چار ہیں ان کی دینی تعلیم اور اسلامی تہذیب کی حفاظت کی طرف توجہ بھی وقت کا ایک اہم کام ہے۔ ایسے مسلمانوں کو بڑی مسلم آبادی میں منتقل بھی کیا جاسکتا ہے۔

اس سلسلہ میں ایک بات یہ بھی قابل توجہ ہے کہ جو تعلیمی ادارے مسلمانوں کی ادارت اور انتظام والنصرام میں ہیں، ان میں دینیات کا ایک کمپلسری سبجکٹ ہونا، عصری تقاضے کی تکمیل میں ضروری ہے۔ اسکے ذریعہ تدریجی طور پر عربی گرامر، عربی ادب کے علاوہ قرآن، حدیث اور فقہ اسلامی کی بقدر ضرورت تعلیم دی جاسکتی ہے۔ دیہات میں دینی تعلیم کا نظام تو ایک "مہم" کی شکل میں جاری کرنے کی ضرورت ہے۔ الحاد، بے دینی اور باطل تحریکوں کی یلغار ان دنوں دیہات اور قریہ جات میں زیادہ ہے۔ اس کا سد باب دردمندانِ دین وملت کی اجتماعی کوششوں ہی کے ذریعہ ممکن ہے۔

بنیادی دینی تعلیم کے سلسلہ میں جماعتی اور تنظیمی سطح پر جمعیۃ العلماء ہند،

امارت شرعیہ بہار و اڑیسہ، تحریک اسلامی ہند اور دینی تعلیمی کونسل اتر پردیش کی کوششیں خصوصیت کے ساتھ قابل ذکر ہیں، اور نئے کام کرنے والوں کو ان سے روشنی مل سکتی ہے۔

نظم ونسق

دینی مدارس و مکاتب میں عام طور پر نظم ونسق کی کمزوری محسوس کی جارہی ہے، جس کی وجہ سے اس کی افادیت اور اثر انگیزی بھی مجروح ہوتی جارہی ہے، اس کی سخت ضرورت ہے کہ نظم ونسق کے معیار کو بلند کیا جائے، کھانے، پینے، بستر، صفائی، ستھرائی اور دیگر تعلیمی وانتظامی امور میں نظم کو مثالی اور پرکشش بنایا جائے۔ تنخواہ کے معیار کو بھی بلند کیا جائے حتی الامکان، نیز دینی مدارس و مکاتب کا کلیدی اور مرکزی نظم ایسے افراد کے ہاتھ میں ہونا چاہئے۔ جو ظاہر و باطن میں شریعت کے پابند ہوں، دین اور دینداروں کی قدر و منزلت ان کے دل میں ہو، علماء سے محبت کرتے ہوں، دیکھا یہ جارہا ہے کہ جو لوگ مزاجاً دین سے ناآشنا ہیں اور تعلیم کو بھی ایک "مادی دوکان" کا درجہ دے کر "تاجرانہ انداز" سے سوچتے ہیں، علم وتحقیق کی خوبو سے دور ہیں، اس کوچہ میں انہوں نے کبھی قدم نہیں رکھا، ایسے لوگوں کے نظام میں دخیل ہونے سے دینی مکاتب و مدارس سلف صالحین کے طریقے اور اپنے مخصوص نہج اور اصول وضابطے سے ہٹ کر انتشار و خلفشار کے شکار اور ذہنی کشمکش کی آماجگاہ ہو جاتے ہیں، "ہر کارے را ہر مرے" (ہر کام کے لئے الگ الگ آدمی مخصوص ہوتے ہیں) کے اصول کو بہر حال پیش نظر رکھنے کی ضرورت ہے۔

مدارس کا باہمی ربط

مدارس کے تعلیمی نظام کی درستی کے لئے ایک اہم ضرورت مدارس کا باہمی ارتباط اور مستحکم وفاق ہے۔ ایسا وفاق جو نصاب تعلیم کا تعین کرے، اور ہر جگہ یکساں نصاب نافذ کرے۔ قابل اساتذہ کی خدمات حاصل کرنے میں اعانت کرے، امتحانات کا مشترک نظام ہو، اساتذہ کے لئے حالات کی رعایت کرتے ہوئے تنخواہوں کا معیار مقرر کرے۔ اسلامیات کے اہم موضوع پر لکچر اور تقریر ہو، طلبار کو تعلیمی اور اساتذہ کو تدریسی تربیت دینے کے کیمپ قائم ہوں، اساتذہ اور طلبہ کے وفود کا تبادلہ ہو، پھر ہر مدرسہ کے لئے تعلیم کا معیار مقرر کیا جائے، اور مرکزی مدارس کی مرکزیت باقی رہے، ایک مدرسہ کے طلبہ اور اساتذہ دوسرے کسی مدرسہ میں جائیں تو ان کے لئے آپ کا کوئی ضابطہ اخلاق ہو۔ اور اس طرح کی دوسری باتیں باہمی مشورے سے سوچی جاسکتی ہیں۔

مگر میرے خیال میں یہ وفاق اسی وقت کامیاب ہو سکتا ہے جبکہ تمام مدارس و مکاتب کا تعاون عمل اور اعتماد حاصل کیا جائے اور اس سے کسی ایک مدرسے کی ترقی شہرت اور بالادستی مقصود نہ ہو، اور وفاقی بورڈ کا الگ دفتر اور عملہ ہو جو شب و روز وفاق کے اغراض و مقاصد کو روبعمل لانے میں سرگرم ہو، اور چند خداترس علمار پر مشتمل ایک اعلیٰ سطحی کمیٹی ہو جس کا فیصلہ کسی بھی معاملہ میں آخری ہو اور یہاں سے جاری کردہ سند کا بھرم اور اعتماد ہو۔

دین کے خدمت گزاروں کی خدمت میں

دین کے خدمت گزاروں میں یقیناً بہت سی خوبیاں ہیں، اللہ تعالیٰ انہیں

خوبیوں کو خوب پروان چڑھائے لیکن اسکے اندر ایک خطرناک ذہن پرورش پارہا ہے۔ وہ ہے اپنے کام کو "سب کچھ سمجھنا" اور دوسرے کے کام کو "کچھ نہ سمجھنا" اس کی بجائے ایک دوسرے کی خوبیوں کا اعتراف ہو، تحقیر آمیز سلوک سے اجتناب کیا جائے، اور ایک دوسرے کی غیبت اور شکایت سے زبان کو آلودہ نہ کیا جائے۔ اس پر نظر رہنی چاہئے کہ دینی مدارس کے کام کی نوعیت اصولی اعتبار سے ایک ہے۔ اس لئے اس وقت اس کی بڑی ضرورت ہے کہ دینی مدارس کے درمیان علمی سوسائٹی، علمی مواخات اور علمی روابط ہوں، اور کسی علمی و دینی عنوان پر آپس میں ملاقات اور مل بیٹھنے کا سلسلہ جاری رہے، ایک بزرگ نے دین کے خدمت گذار کے مخلص اور غیر مخلص ہونے کی اونچی پہچان یہ بتائی ہے کہ تم جس قسم کی دین کی خدمت کر رہے ہو، اگر وہی خدمت کوئی دوسرا کر رہا ہو اور اس خدمت اور خدمت گذار سے دل میں خوشی محسوس کر رہے ہو تو تم "مخلص" ہو، اور اگر دل میں نفرت، کدورت اور رقابت ہو تو تم "غیر مخلص" ہو۔ ظاہر ہے اللہ تعالیٰ کے یہاں اندر کے اخلاص کی قدر ہے، نہ کہ کسی بھی عمل کے ظاہری خول اور لبادے کی، قرآن حکیم کی یہ آیت ایسے ہی موقع کے لئے ہے:

لن ینال اللہ لحومھا ولا	اللہ کے پاس ان کا گوشت و خون نہیں
دمائھا ولکن ینالہ التقوی منکم	پہونچتا لیکن اللہ تک تمہارا تقویٰ پہونچتا
(الحج: ۳۷)	ہے۔

ضمیمہ

(۱) ایک مضمون پر ناقدانہ نظر

(۲) علماء کی طرف سے انگریزی تعلیم کی مخالفت
حقیقت کیا ہے؟

(۳) دینی مدارس کا نصابِ تعلیم
اہم رائیں اور مشورے

(۴) دینی مدارس کی نصابی کتب فقہ پر ایک نظر

(۵) چند تجاویز

ایک مضمون پر ناقدانہ نظر

"زیر نظر مضمون آج سے سات سال قبل لکھا گیا تھا۔ اگرچہ کہ اس میں بعض دوسرے مباحث بھی آ گئے ہیں، لیکن غالب حصہ دینی مدارس کی ضرورت و اہمیت سے متعلق ہے، اور بعض شکوک و شبہات کے جواب دیئے گئے ہیں، اس لئے بعینہ اسے راقم الحروف کی ادارت میں شائع ہونے والے پندرہ روزہ "قرطاس و قلم" سے نقل کیا جا رہا ہے، جو بطور اداریہ اس جریدہ میں شائع ہوا تھا، امید کہ دینی مدارس کے سلسلہ میں جو غلط فہمیاں بعض گوشوں میں پائی جاتی ہیں، ان کا اس مضمون سے ازالہ ہو سکے گا۔"

: مؤلف

گذشتہ ماہ بعض رسائل و جرائد میں جناب رفیع الدین احمد کا ایک مضمون "عصر حاضر کیلئے ایک اور سرسید کی ضرورت" کے عنوان سے شائع ہوا ہے، اس مضمون کے بنیادی تخیل اور مرکزی فکر سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ اس زمانہ میں ایک اور سرسید کی ضرورت ہے جو مسلمانوں کی تعلیمی پسماندگی کو دور کرے اور ان کے اندر یہ احساس پیدا کرے کہ کوئی قوم تعلیم کے بغیر ترقی نہیں کر سکتی ہے، مسلمانوں میں ایسا شعور بھی بیدار کرے جس سے وہ نئے زمانے کی نئی ضرورتوں کو سمجھ سکیں اور "تعمیر نو

سے ڈرنا، طرزِ کہن پر اڑنا" وہ چھوڑ دیں۔

ظاہر ہے کوئی صاحب علم و فکر اس طرح کے خیالات کی تردید نہیں کر سکتا بلکہ دو چار ہاتھ بڑھ کر ہی وہ تائید کرے گا، لیکن مضمون نگار اس بنیادی تخیل کو پیش کرنے میں الفاظ، انداز، تعبیرات اور سرسیّد احمد خاں (۱۸۹۸ـ۱۸۱۷ء) کا سہارا لینے میں احتیاط اور واقعیت کو ملحوظ نہیں رکھ سکے ہیں جس کی وجہ سے ان کا یہ مضمون مختلف قسم کی غلط فہمیوں کو پیدا کرنے کا موجب بن گیا ہے۔ اور اس کی افادیت اور نافعیّت کی روح مجروح ہو کر رہ گئی ہے۔ اس لئے ضروری ہے کہ مضمون کے بعض مندرجات (پردہ، دینی مدارس اور سود سے متعلق خیالات) پر نظر ڈالی جائے تاکہ حقائق سامنے آسکیں اور پیدا شدہ غلط فہمیوں کا ازالہ ہو سکے۔

جن لوگوں نے سرسیّد کی زندگی کا بنظرِ غائر مطالعہ کیا ہے، وہ جانتے ہیں کہ سرسیّد اسلام اور مسلمان دونوں کے حق میں نہایت مخلص تھے۔ البتہ جدید ذہن اور نئے علوم کو سامنے رکھتے ہوئے اسلام کی حقانیت کو ثابت کرنے اور اس سے متعلق شکوک و شبہات کو رفع کرنے میں جس طریقے اور اندازِ فکر کو انہوں نے اپنایا تھا اور مسلمانوں کی ترقی اور اصلاح کے لئے جن چیزوں کو وہ ضروری قرار دیتے تھے، اس سے بعض علماء اسلام کو شدید اختلاف تھا اور اس اختلاف میں وہ حق بجانب تھے، جس کا اعتراف سرسیّد کے سوانح نگار اور معتقد خاص مولانا الطاف حسین حالی (۱۹۱۴ـ۱۸۳۴ء) نے بھی "حیاتِ جاوید" (صفحہ ۶۳ـ۶۴) میں کیا ہے۔ لیکن اس حقیقت کے باوجود کہ سرسیّد نے بہت سارے مذہبی معاملات میں اپنی آزادانہ رائے دی ہے اور علماء کو ان کی اس طرح کی رایوں سے سخت اختلاف بھی رہا ہے (جس کا تفصیلی تذکرہ مولانا حالی نے "حیاتِ جاوید" میں صفحہ ۵۲۰ سے صفحہ ۵۴۲ تک کیا ہے) وہ پردہ کے بارے میں جمہور علماء کی رائے سے اتفاق رکھتے تھے۔ دینی مدارس کی عظمت و

اہمیت کے بھی قائل تھے۔ سود کے بارے میں بھی ان کا خیال بالکلیہ غیر محتاط نہیں تھا ' ان تینوں اُمور میں سرسیّد کے جو خیالات تھے' وہ ذیل میں پیش کئے جا رہے ہیں:

"عصر حاضر کے لئے ایک اور سرسیّد کی ضرورت" کے مضمون نگار نے پردہ کے مسئلہ پر اظہارِ خیال کرتے ہوئے لکھا ہے کہ "پردہ کی قید بھی ناروا ہے' اب زمانہ اس کا متحمل نہیں ہو سکتا" لیکن اس سلسلہ میں خود سرسید کس نظریہ کے حامل تھے' اس کا اندازہ مولانا حالی کی درج ذیل عبارت سے ہو سکے گا:

"مستورات کے پردہ کی نسبت ان کی رائے تعلیم یافتہ نوجوانوں کے بالکل برخلاف تھی۔ وہ ہندوستان میں مسلمانوں کی حالت کو اس قابل نہیں سمجھتے تھے کہ ان کی عورتیں منھ کھولے بے حجاب بازاروں میں پھریں ـــــ ایک دفعہ شاید" مولوی عبدالحلیم شرر" نے اپنے اخبار میں ان کی نسبت لکھ دیا تھا کہ وہ پردے کے مخالف ہیں اس پر منشی سراج الدین نے ان سے اس باب میں ان کی رائے دریافت کی۔ سرسیّد ان کے خط کے جواب میں لکھتے ہیں: "میں پردہ کی رسم کا متعدد وجوہ سے نہایت طرفدار ہوں اور بالتخصیص ہندوستان میں اس میں میرا کچھ اجتہاد نہیں ہے۔ نہ میں نے اس پر کبھی غور کیا' مگر فقہائے اسلام کا یہ مسئلہ ہے کہ منھ اور ہاتھ پہنچے تک اور پاؤں ٹخنے تک اور ستر میں داخل نہیں ہیں' فقہائے متاخرین نے بسبب فسادات زمانہ کے منھ کو بھی پردہ میں داخل کیا ہے۔ مولوی شرر نے میری نسبت غلط لکھ دیا ہے"

(حیات جاوید صفحہ ۷۷۳)

مولانا حالی نے "حیات جاوید" ہی میں صفحہ (۶۴۴) پر جو کچھ لکھا ہے اس کے مطالعہ سے بھی ظاہر ہے کہ سرسید انگریزوں سے دوستانہ تعلقات اور میل جول کے بہت زیادہ خواہشمند تھے مگر انگریز اس راہ میں سب سے زیادہ رکاوٹ "پردہ" کو سمجھتے تھے۔ انگریزوں کے اس عذر کو رفع کرنے اور اپنی دلی خواہش کی تکمیل

میں سرسید کے لئے یہ آسان تھا کہ وہ یہ کہتے، موجودہ حالات کا تقاضہ ہے کہ پردہ کی قید کو اٹھا دیا جائے، یہ بہت ناروا ہے۔ اس کی وجہ سے بہت ساری رکاوٹیں پیش آرہی ہیں اور مسلمانوں کی تعلیمی، معاشرتی اور سیاسی ترقی کے لئے یہ مانع ہے مگر اپنی تمام تر روشن خیالی کے باوجود انہوں نے ایسا نہیں کیا اور پردہ کے "شرعی حکم" کو انگریزوں کی "مزاج داری" کے مقابلے میں ترجیح دی۔ مولانا حالی نے اس ضمن میں یہ تبصرہ خوب کیا ہے کہ "حق یہ ہے کہ ایسی دو مختلف قوموں میں دوستانہ میل جول ہونا غیر ممکن ہے، جن میں سے ایک قوم کا مردانہ سوسائٹی میں شریک ہونا اس کے لئے باعثِ عزت سمجھا جاتا ہے اور دوسری قوم میں باعثِ شرم"۔

یہ بات تو پردہ سے متعلق ہوئی، دینی مدارس کے بارے میں بھی سرسید کے خیالات مضمون نگار کے خیالات سے ہم آہنگ نہیں ہیں۔ مضمون نگار نے لکھا ہے:

"جس چیز کو ہم دینی تعلیم کہتے ہیں اس کے نتیجے میں ایک ایسی مفلوج اور قابل رحم نسل تیار ہوتی ہے جو اپنی زندگی چندے، خیرات، صدقات اور زکوٰۃ کی آمدنی کے سہارے بسر کرنے پر مجبور ہوتی ہے، اس لئے دینی درسگاہیں اپنی دینی تعلیم کو جاری رکھتے ہوئے جدید علوم کے باقاعدہ اسکولوں اور کالجوں میں بدل جانی چاہئیں"۔

اس موقع پر سرسید کے خیالات کو پیش کرنے سے پہلے یہ بات سمجھ لینی چاہئے کہ بنیادی اور ضروری دینی تعلیم سے واقفیت تو ہر مسلمان مرد اور عورت کیلئے لازمی ہے۔ محدثین کی تشریح کے مطابق حدیث نبوی "طلب العلم فریضۃ علی کل مسلم" کا یہی مطلب ہے، مگر علم دین کو تحقیقی اور تفصیلی طور پر حاصل کرنا، امتِ مسلمہ کے تمام افراد کے لئے نہیں بلکہ بعض افراد کیلئے ضروری ہے اور امت کی اجتماعی ضرورتوں میں سے یہ ایک اہم ترین ضرورت ہے جس کی طرف قرآن حکیم (سورۂ توبہ آیت ۱۲۲) نے بھی توجہ دلائی ہے۔ "دینی مدارس" کا وجود دراصل امت کی اسی اہم ضرورت کی تکمیل

کی خاطر ہے۔ ان مدارس کا سلسلۂ نسب (بقول مولانا سید ابوالحسن علی ندوی) پیغمبرِ اسلام محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی قائم کردہ مسجد نبویؐ میں سب سے پہلی اقامتی دینی درسگاہ "جامعہ صفہ" سے جا کر ملتا ہے۔ ایسے قابلِ قدر اور تاریخی عظمت و تقدس کے حامل دینی مدارس سے فارغ التحصیل علماء کو "مفلوج" اور "قابلِ رحم نسل" قرار دینا حد درجہ زیادتی، ملتِ اسلامیہ کی اہم ترین ضرورت (قیامت تک ایک تسلسل کے ساتھ دین کی حفاظت و اشاعت) سے چشم پوشی، جدید علوم کی ظاہری چمک سے مرعوبیت اور "معاد" کے مقابلے میں "معاش" کو ترجیح دینے کی دلیل ہے۔

کاشف، مضمون نگار کی نظر اس پر ہوتی کہ اجتماعی زندگی میں تقسیم کار کے اصول کو اپنانا ناگزیر ہوتا ہے۔ اسی بنیاد پر قرآنی حکم کے پیشِ نظر "کچھ" کیلئے یکسو ہو کر علمِ دین کا تفصیلی علم حاصل کرنا ضروری ہو جاتا ہے۔ تاکہ اس میں کامل مہارت پیدا ہو۔ باقی "بہت کچھ" کیلئے تو ضروری علمِ دین کی تحصیل کے ساتھ جدید علوم میں دسترس حاصل کرنے اور سائنس، ٹیکنالوجی اور مختلف قسم کی صنعت و حرفت میں دیگر اقوام سے سبقت لے جانے کی راہیں کھلی ہوئی ہیں۔ اس سلسلہ میں شریعت کی جانب سے کوئی روک ٹوک نہیں ہے۔ نہ ہی کسی باشعور عالمِ دین نے انگریزی تعلیم اور جدید علوم حاصل کرنے کے بارے میں عدمِ جواز کا فتویٰ دیا ہے، بلکہ معاملہ اس کے برعکس ہے۔ چنانچہ انگریز کے زمانہ میں جب شاہ عبدالعزیزؒ (۱۸۲۳ــ۱۷۴۶ء) سے انگریزی کالجوں میں تعلیم حاصل کرنے کے متعلق فتویٰ لیا گیا تھا تو انہوں نے بر ور کہا "جاؤ" انگریزی کالجوں میں پڑھو، اور انگریزی زبان سیکھو، شرعاً ہر طرح جائز ہے۔" اسی طرح شیخ الہند مولانا محمود حسنؒ (۱۹۲۰ــ۱۸۵۱ء) نے جامعہ ملیہ اسلامیہ (قیام ۱۹۲۰ء) کے خطبۂ افتتاحیہ میں فرمایا تھا:

"آپ میں سے جو حضرات محقق اور باخبر ہیں وہ جانتے ہوں گے کہ میرے بزرگوں

نے کسی وقت بھی کسی اجنبی زبان سیکھنے یا دوسری قوم کے علوم و فنون حاصل کرنے پر کفر کا فتویٰ نہیں دیا۔" (موج کوثر صفحہ ۹۰) اس حقیقت کو حکیم شاعر اکبر الٰہ آبادی نے بھی اپنے مخصوص انداز میں اس طرح بیان کیا ہے: ؎

تم شوق سے کالج میں پھلو، پارک میں پھولو
جائز ہے غباروں میں اڑو، چرخ پہ جھولو
بس ایک سخن بندۂ عاجز کا رہے یاد
اللہ کو اور اپنی حقیقت کو نہ بھولو

ہمیں یہ تسلیم ہے کہ دینی مدارس کے موجودہ نصاب اور طریقۂ تعلیم میں بدلتے ہوئے حالات کے پیشِ نظر تبدیلی کی ضرورت ہے، اس سے بھی انکار نہیں کہ ضمنی طور پر مرحلہ وار علوم جدیدہ کو داخلِ نصاب کرنا چاہئے اور طلبہ کو جدید نظریات اور اسلامی تعلیمات کا تقابلی مطالعہ کرانا چاہئے اور اربابِ دینی مدارس کو چاہئے کہ وہ اس طرح کے مشورے کو خندہ پیشانی کے ساتھ قبول کریں، اور یہ بات اطمینان کی ہے کہ بعض دینی مدارس اس طرف خصوصیت کے ساتھ توجہ دے رہے ہیں جس کے خاطر خواہ نتائج بھی برآمد ہو رہے ہیں لیکن اس وقت دینی مدارس کا عام جو نظام ہے اس کو پیشِ نظر رکھ کر بھی ان کی افادیت اور اہمیت سے انکار کرنا اور انہیں جدید علوم کے باقاعدہ اسکولوں اور کالجوں میں تبدیل کرنے کا مشورہ دینا حقائق سے عدم واقفیت اور دینی مدارس کے اغراض و مقاصد سے لاعلمی کی دلیل ہے یا پھر "تجاہل عارفانہ" ہے۔ مضمون نگار اس کے بجائے یہ کہتے کہ ایسے اسکول اور کالج جو مسلمانوں کے زیرِ انتظام چلتے ہیں وہاں مسلم طلبہ اور طالبات کے لئے سیکولر ملک کے سیکولر دستور کو سامنے رکھتے ہوئے حکمتِ عملی کے ساتھ اخلاقی اور بنیادی دینی تعلیم کا انتظام کیا جائے تو یہ بات زیادہ مناسب

تھی اور اس سے وقت کی ایک اہم ضرورت کا اظہار بھی ہوتا تھا سرسید نے اپنے "مدرسۃ العلوم" (جو بعد میں مسلم یونیورسٹی علیگڑھ کے نام سے مشہور ہوا) کی بنیاد میں اس کی طرف خاص توجہ دی تھی اور یہ کہا تھا کہ فلسفہ ہمارے دائیں ہاتھ میں ہوگا، نیچرل سائنس بائیں ہاتھ میں اور "لَا اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ مُحَمَّدٌ رَّسُوْلُ اللّٰہِ" کا تاج سر پر" (موج کوثر صفحہ ۱۴۶) اور یہ بھی فرمایا تھا کہ "علم اور اسلام کا مکمل نمونہ پیش کرنے پر ہی ہماری قوم کو عزت حاصل ہوگی" (حیاتِ جاوید صفحہ ۲۱۴) لیکن ہمارا دل ان کے اس "سوز" سے تو خالی ہے مگر ہم اس "ساز" کو چھیڑتے رہے کہ "سرسید کی ساری زندگی قدامت پسند مسلمانوں سے معرکہ آرائی میں گزری" قرآن کے الفاظ میں "ھٰذَا اِفْکٌ قَدِیْمٌ" یہ الٹی تقسیم ہے

مضمون نگار نے دینی مدارس کے فضلاء کو "مفلوج" قرار دیا ہے، اگر اس لفظ کو لکھنے سے پہلے تحریک آزادی ہند میں علماء کے کردار کو سامنے لے آیا جاتا یا نزہۃ الخواطر (جس کی آٹھ جلدوں میں ہندوستانی علماء و مشائخ کا خصوصیت کے ساتھ تذکرہ ہے) العلم والعلماء، علمائے سلف، تاریخ دعوت و عزیمت، روشن مستقبل، علمائے ہند کا شاندار ماضی اور ہندوستان میں نظام تعلیم و تربیت کا مطالعہ کر لیا جاتا یا سرسید کے بارے میں یہ بات پیش نظر رکھی جاتی کہ ان کی تعلیم بھی پرانے اسلامی اصولوں پر ہوئی ہے۔ اور دینی مدارس میں درس نظامی کی پڑھائی جانے والی بہت سی فارسی اور عربی کتابیں انہوں نے شاہ ولی اللہ کے پوتے شاہ مخصوص اللہ، شاہ عبدالعزیز کے جانشین شاہ محمد اسحاق اور مولانا محمد قاسم نانوتوی کے استاذ اور محسن مولانا مملوک علی نانوتوی سے پڑھی ہیں، یا ہندوستان میں اس وقت دارالعلوم دیوبند، مظاہر علوم سہارنپور، ندوۃ العلماء لکھنؤ، آل انڈیا مسلم پرسنل لا بورڈ، تبلیغی جماعت، جمعیۃ العلماء، جماعت اسلامی، امارت شرعیہ بہار و اڑیسہ، دائرۃ المعارف، المصنفین، ندوۃ المصنفین، مجلس تحقیقات و نشریات اسلام، مرکزی مکتبہ اسلامی، ادارہ تحقیق و تصنیف

اسلامی اور اسلامی مرکز اور اب آل انڈیا ملی کونسل، اسلامک فقہ اکیڈمی اور ادارۃ المباحث الفقہیہ بھی، کے کام کی جو نوعیت اور وسعت ہے اور ان اداروں کی بنیاد، کام اور تاریخی پس منظر میں علماء کا جو مرکزی کردار ہے اس پر نگاہ رکھی جاتی تو مضمون نگار "مفلوج" کا غیر حقیقت پسندانہ بلکہ جارحانہ لفظ استعمال نہیں کرتے اور انہیں معلوم ہوتا کہ یہ "مفلوج" زندگی کی دوڑ دھوپ اور ملک وملت کے کام میں کتنے فعال اور سرگرم ہیں، اور ان کے اندر کتنی بیدار مغزی اور زمانہ شناسی ہے۔

معتدل اور متوازن بات تو یہ ہے کہ ہماری آبادی میں مسلم یونیورسٹی جامعہ ملیہ اور جامعہ عثمانیہ کی بھی ضرورت ہے اور دارالعلوم دیوبند اور مظاہر علوم اور ندوۃ العلماء کا وجود بھی ناگزیر ہے۔ اسی طرح عصری تعلیم کی افادیت کو سمجھنے اور اسکا مزاج وذوق پانے والے سرسید، مولانا محمد علی اور میر عثمان علی خاں جیسے دانشوروں کی بھی ضرورت ہے اور مولانا محمد قاسم نانوتوی، مولانا محمد مظہر نانوتوی اور مولانا سید محمد علی مونگیری جیسے دینی علوم کی اہمیت کو محسوس کرنے اور ان سے خاص دلچسپی اور شغف رکھنے والے علماء کی بھی ضرورت ہے (جنہوں نے علی الترتیب مذکورہ بالا اداروں کی بنیادیں رکھی ہیں) یہ دو طرح کے ادارے اور اشخاص ہمارے دو طرح کے مقاصد کی تکمیل کا ذریعہ ہیں۔ ان میں سے کسی ایک کی کمی ہماری ملی زندگی کو ناقص بنا دیتی ہے اور دونوں کی موجودگی اس کی تکمیل بلکہ تزئین کا باعث ہے۔ چشم تصور میں آپ آئندہ ایسے (۵۰) سال کو لائیے جس میں صرف ایک ہی طرح کی درسگاہ ہو تو اس وقت دوسری طرح کی درسگاہ کا عظیم خلا معلوم ہوگا۔ اور اس کے نہ ہونے سے ملت جن نازک مسائل سے دوچار ہوگی اس کا صحیح اندازہ ہوگا، غور کی نظر اس نکتہ کو پوری طرح کھول دیگی۔

جہاں تک تعلق دینی مدارس کے بارے میں سرسید کے خیالات کا ہے تو اسکا صحیح اندازہ ان کے اس مضمون سے ہوگا جسے انہوں نے دارالعلوم دیوبند

کے بانی مولانا محمد قاسم نانوتوی کی وفات کے بعد نہایت مؤثر انداز میں لکھا ہے جس میں انہوں نے علوم دینیہ کی تعلیم کیلئے مدرسہ دیوبند کو نہایت مفید قرار دیا ہے۔ اور خواہش کی ہے کہ مولانا نانوتوی کی یہ عمدہ یادگار ہمیشہ قائم اور مستقل رہے۔ سرسید کے مضمون کا متعلقہ حصہ یہ ہے:

"افسوس ہے کہ ہماری قوم بہ نسبت اس کے کہ عملی طور پر کوئی کام کرے زبانی عقیدت اور ارادت سے بہت زیادہ ظاہر کرتی ہے۔ ہماری قوم کے لوگوں کا یہ کام نہیں ہے کہ ایسے شخص کے دنیا سے اٹھ جانے کے بعد صرف چند کلمے حسرت اور افسوس کے کہہ کر خاموش ہو جائیں، یا چند آنسو آنکھ سے بہا کر اور رومال سے پونچھ کر چہرہ صاف کر لیں، بلکہ ان کا فرض ہے کہ ایسے شخص کی یادگار قائم رکھیں۔

دیوبند کا مدرسہ ان کی ایک نہایت عمدہ یادگار ہے، اور سب لوگوں کا فرض ہے کہ ایسی کوشش کریں کہ وہ مدرسہ ہمیشہ قائم اور مستقل رہے، اور اس کے ذریعے سے تمام قوم کے دل پر ان کی یادگاری کا نقش جما رہے۔"

(موج کوثر، صفحہ ۳۶۸)

اس تاثر سے مدارس کے بارے میں سرسید کے فکر و خیال کی سمت خود بخود متعین ہو جاتی ہے اور یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ ایسے اداروں کی ضرورت و اہمیت اور افادیت و نافعیت کے وہ قائل تھے۔ اور اس کے علیحدہ وجود اور تشخص کو ضروری سمجھتے تھے۔

رہ گئی بات چندہ کے سہارے زندگی گزارنے کی، تو یہ ایک سطحی قسم کا تبصرہ

ہے، سب جانتے ہیں کہ جو لوگ قوم وملت کے کام میں ہمہ تن مصروف ہو جاتے ہیں اور ان کے سارے اوقات اس کیلئے گھر جاتے ہیں تو ایسی صورت میں ان کے اخراجات اور ضروریات کی تکمیل قوم وملت کے افراد کی ذمہ داری ہے۔ سورۂ بقرہ کی آیت (۲۷۳) سے واضح طور پر اس کا اشارہ ملتا ہے۔ یہ ایک ایسا اصول اور ضابطہ ہے جس سے سرکاری عہدے پر فائز بڑے سے بڑے ذمہ دار کو بھی مستثنیٰ قرار نہیں دیا جا سکتا اور ایسے لوگوں کی تنخواہوں کا انحصار بھی "چندے" پر ہی ہوتا ہے، خواہ اصطلاحی اعتبار سے اس کو چندہ نہیں کہا جائے، مختلف قسم کے ٹیکس سے تعبیر کیا جائے مگر نام کے فرق سے ایک چیز کی حقیقت نہیں بدلا کرتی ہے، پھر عصری درسگاہوں میں ڈونیشن کے نام پر جو بھاری رقم لی جاتی ہے۔ اس کی حیثیت بھی تو چندہ کی ہے، اصل بات یہ ہے کہ پانچ دس روپے کی وصولی دینی اداروں کی طرف سے ہو تو چندہ اور خیرات کا نام دیا جاتا ہے اور ہزاروں اور لاکھوں کی وصولی عصری اداروں کیلئے ہو تو ڈونیشن اور گفٹ سے تعبیر کیا جاتا ہے مگر اہل نظر شئی کی حقیقت کو بہر حال سمجھتے ہیں ــــ اس کے علاوہ مضمون نگار کو چاہئے کہ وہ سرسید کے چندہ کی مہم پر نظر ڈالیں انہیں معلوم ہوگا کہ سرسید نے اپنے کالج کے لئے چندہ کی کیسی کیسی تدبیریں اختیار کی تھیں۔ (دیکھئے حیاتِ جاوید، ص: ۱۹۰ تا ۲۰۲) اس لئے بنظر غائر دیکھا جائے تو یہ بات تضحیک واستہزاء کی نہیں بلکہ اجتماعی اور قومی اور ملی ضرورتوں کی تکمیل کا ٹھوس اور مضبوط ذریعہ ہے۔ عہد نبوت اور دورِ خلافت سے بھی اس کا ثبوت ملتا ہے۔ اصل میں فرق آنکھوں کا نہیں بینائی کا ہے۔ ایک ہی چیز میں عیب بیں کو عیب اور ہنر مند کو ہنر نظر آتا ہے۔

آخری بات سود سے متعلق ہے۔ یہ حقیقت ہے کہ سود لینا اور سود دینا نص شرعی سے حرام ہے اور اس کی حرمت پر ہر زمانہ میں علماء کا اتفاق رہا ہے۔ مگر ملکی حالات اور زمانہ کے تغیرات کے اعتبار سے بعض شکلوں میں سود کے جواز اور عدم جواز میں علماء کا

اختلاف رہا ہے۔ یہ ایک نازک موضوع اور تفصیل طلب بحث ہے۔ اہل ذوق اگر سرکاری اور کاروباری سود کی حیثیت اور اس کے جواز اور عدم جواز کی صورتوں کو جاننا چاہتے ہیں تو ان کے لئے فقیہ العصر قاضی شریعت مولانا مجاہد الاسلام قاسمی کی کتاب "چند اہم فقہی مسائل" کا مطالعہ نہایت مفید ہے، مولینا موصوف نے اس موضوع پر فاضلانہ اور مجتہدانہ بحث کی ہے لیکن سرسید نے اس مسئلہ پر جو اظہار خیال کیا ہے (دیکھئے حیات جاوید صفحہ ۵۲۶) اس سے کلی طور پر اتفاق ضروری نہیں، البتہ بعض قیود لگا کر احتیاط سے کام انہوں نے ضرور لیا ہے مگر مضمون نگار نے صاف طور پر یہ لکھ کر کہ "کاروباری سود کی اجازت کے بغیر صنعتی و تجارتی میدان میں قدم رکھنا محال ہے" احتیاط کو ملحوظ نہیں رکھا ہے، سود کے سلسلہ میں اس طرح کا آزادانہ خیال سود مند نہیں ہے۔ جس علم اور فن میں انسان ماہر نہ ہو اس میں اسے حتمی طور پر رائے دینے میں حد درجہ محتاط ہونا چاہئے اور ایسے موقع پر قلم اور قدم دونوں کی ذمہ داری کو پورے طور پر محسوس کرنا چاہئے اور بقول علامہ اقبالؒ:

زندگی کی رہ میں چل لیکن ذرا بچ بچ کے چل
یہ سمجھ لے کوئی میناخانہ بارِ دوش ہے

(پندرہ روزہ قرطاس و قلم)
۲۵ فروری ۱۹۸۶ء

علماء کی طرف سے انگریزی تعلیم کی مخالفت

حقیقت کیا ہے؟

از: جناب سید محبوب رضوی مرحوم (مرتب تاریخ دارالعلوم دیوبند)

انگریزی تعلیم اور انگریزی مدارس سے مسلمانوں کو باز رکھنے کے بارے میں علماء اور مدارس عربیہ کی نسبت کئی غلط فہمیاں عام طور پر پائی جاتی ہیں یا پیدا کر دی گئی ہیں۔ علمائے کرام کے تعلق ابھی تک یہ مغالطہ پایا جاتا ہے کہ انھوں نے انگریزی اقتدار کے ابتدائی زمانہ میں انگریزی تعلیم کو ناجائز قرار دیکر مسلمانوں پر دنیاوی ترقی کے دروازے بند کر دیئے جس سے وہ ترقی کے میدان میں برادرانِ وطن کے مقابلے میں پچاس سال پیچھے رہ گئے۔

یہ ایک شدید غلط فہمی ہے، انگریزی تعلیم کو کبھی ناجائز اور حرام نہیں کہا گیا، بلکہ وہ تہذیب و کلچر جو انگریزی تعلیم کے ساتھ لازمی قرار دیا گیا تھا اور اسی کو ترقی کا واحد ذریعہ سمجھا جاتا تھا، علماء کو صرف اس سے اختلاف تھا، مناسب ہوگا کہ اس موقع پر اس الزام پر تاریخی حقائق کی روشنی میں غور کر کے دیکھا جائے کہ اس کی اصلیت کیا ہے۔ ٹھیک اسی زمانے میں جبکہ سرسید احمد مرحوم کی تعلیمی تحریک کا آغاز تھا، فقہ حنفی کے قدیم تعلیمی مرکز "فرنگی محل لکھنؤ" کے یگانۂ روزگار عالم مولانا عبدالحئی لکھنوی نے انگریزی تعلیم کے متعلق فتویٰ دیا تھا:

> "لغت انگریزی کا پڑھنا یا انگریزی لکھنا سیکھنا اگر بلحاظ تشبہ ہو تو ممنوع ہے اور اگر اس لیے ہو کہ ہم انگریزی میں لکھے ہوئے خطوط پڑھ سکیں اور ان کی کتابوں کے مضامین سے آگاہ ہو سکیں تو کچھ مضائقہ نہیں۔ مشکوٰۃ شریف میں ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے حضرت زید بن ثابت رضی اللہ عنہ کو یہود کا خط (عبرانی) سیکھنے کے لیے حکم فرمایا تو انھوں نے تھوڑے ہی دنوں میں اسے سیکھ لیا۔" (مجموعہ فتاویٰ مولانا عبدالحئی، باب تعلم العلوم جلد دوم ص)

حضرت مولانا رشید احمد گنگوہی رحمۃ اللہ علیہ کے فتاویٰ میں انگریزی پڑھنے پڑھانے کے استفتاء کے جواب میں تحریر ہے:

"انگریزی زبان سیکھنا درست ہے، بشرطیکہ کوئی معصیت کا مرتکب نہ ہو اور نقصان دین میں اس سے نہ آئے۔" (فتاویٰ رشیدیہ۔ جلد اول ص۶۴)

ایسٹ انڈیا کمپنی کے ابتدائی دور میں حضرت شاہ عبدالعزیز دہلویؒ کا فتویٰ بھی یہی تھا کہ انگریزی پڑھنا جائز ہے۔ غرض کہ علمائے کرام نے کسی زمانے میں بھی نفس تعلیم انگریزی سے کبھی اختلاف نہیں کیا، بلکہ حصول معاش اور علم و آگہی کے لیے صراحتہً اس کے جواز کا فتویٰ دیا، جیسا کہ خود عہد نبوت میں حضرت زید بن ثابتؓ کی مثال سے صاف واضح ہے۔ البتہ جس صورت میں مختلف اسباب سے متعلم کے اعتماد و اعتقاد و ایمان پر اس کا اثر پڑتا ہو اور وہ غیر اسلامی اخلاق اور خلاف اسلام معتقدات کے اختیار کر لینے کا ذریعہ بنتی ہو، صرف اس کو ناجائز بتلایا گیا تھا۔

واقعہ دراصل یہ ہے کہ انگریزی زبان سے مسلمانوں کے اجتناب کے متعدد اسباب تھے۔ سب سے پہلا سبب تو یہ تھا کہ ایک طرف تو مسلمانوں کے دلوں میں حملہ آور انگریز کے خلاف جس نے انھیں حکومت و سلطنت سے محروم کر دیا تھا، شدید غیظ تھا۔ وہ اس کی ہر چیز کو نفرت کی نظر سے دیکھتے تھے۔ انگریز کے علوم اور اس کی تہذیب و تمدن کی نسبت مسلمانوں میں معاندانہ جذبات کا موجود ہونا بالکل قدرتی بات تھی۔

دوسری طرف انگریز بھی اپنا اصل سیاسی حریف مسلمانوں ہی کو سمجھتا تھا۔ ہر چند ۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی میں ہندو، مسلمان دونوں قوموں کے افراد شریک تھے اور دونوں قوموں نے مل کر بقدر استعداد اس جنگ میں حصہ لیا تھا، مگر انگریز کی نظر میں اس کا اصل مدمقابل مسلمان ہی تھا۔ اس لیے انگریز نے قابو یافتہ ہونے کے بعد اسی کو "اصل باغی" سمجھ کر زیادہ سے زیادہ اپنے ظلم و استبداد کا نشانہ بنایا، ملک کی ہر سربلندی اور آسودہ حالی سے مسلمانوں کو محروم رکھنے کی پالیسی اختیار کی گئی، اس کا خیال تھا کہ تعلیمی لحاظ سے جب تک مسلمانوں کو پست اور ناکارہ نہ بنا دیا جائے گا، اس وقت تک حکومت اور سربلندی کا خواب ان کے دماغوں سے نہیں نکل سکے گا۔ یہ زخم ایسا گہرا لگایا گیا تھا، جو چند روز میں مندمل ہونے والا نہ تھا۔

اسی کے ساتھ ہندوستان میں پادریوں کو تبلیغ عیسائیت کی نہ صرف اجازت تھی، بلکہ پشت پناہی بھی ان کو حاصل تھی، اسکولوں اور کالجوں کے مدرسین عموماً پادری ہوتے تھے۔ انجیل کا درس لازمی تھا، اس چیز سے نہ صرف علماء کو اختلاف تھا، بلکہ کوئی عامی سے عامی مسلمان بھی ایسی حالت میں اپنی اولاد کو اسکولوں میں بھیجنے پر آمادہ نہیں ہوتا تھا۔

مولانا فضل حق خیرآبادی جن کو فتویٰ جہاد ۱۸۵۷ء کے جرم میں کالے پانی کی سزا دی گئی تھی اپنے زمانۂ اسارت کی تصنیف "الثورۃ الہندیہ" میں لکھتے ہیں:

"انگریزوں نے تمام باشندگان کو نصرانی بنانے کی اسکیم بنائی، اُن کا خیال تھا کہ ہندوستانیوں کو کوئی مددگار اور معاون نصیب نہ ہوسکے گا، اس لیے انقیاد و اطاعت کے سوا سرتابی کی جرأت نہ ہوسکے گی۔ انگریزوں نے اچھی طرح سمجھ لیا تھا کہ مذہبی بنیاد پر حکمرانوں کا باشندوں سے اختلاف تسلط و قبضہ کی راہ میں سنگ گراں ثابت ہوگا۔ اس لیے پوری جاں فشانی اور تن دہی کے ساتھ مذہب و ملت کے مٹانے کے لیے طرح طرح کے مکر و حیلہ سے کام لینا شروع کیا۔ انھوں نے بچوں اور نابینوں کی تعلیم اور زبان و دین کی تلقین کے لیے شہروں اور دیہات میں مدرسے قائم کیے اور پھیلے علوم و معارف کے مٹانے کی پوری کوشش کی۔" (الثورۃ الہندیہ صفحہ ۳۵۷ - ۳۵۶)۔

یہ تھے وہ اسباب جو مسلمانوں کے لیے انگریزی اسکولوں اور کالجوں کی طرف جانے سے مانع ہوئے، مگر انگریز نے نہایت ہوشیاری اور کمال چابکدستی کے ساتھ اپنے آپ کو مسلمانوں کی تعلیمی پستی کے الزام سے بچانے کے لیے غریب علماء کے سر یہ الزام لگادیا کہ مسلمانوں کو انگریزی کے حصول سے ان کے علماء نے باز رکھا، جس کی وجہ سے مسلمان تعلیمی میدان میں پچاس سال پیچھے رہ گئے۔ اس الزام کا اس شدّ و مد سے پروپیگنڈہ کیا گیا کہ خود مسلمانوں کو اس کا یقین آگیا۔

چنانچہ جب پادریوں کی سرگرمیوں کو ان کی مسلسل ناکامی نے سرد کر دیا اور انجیل کی تعلیم اسکولوں کے نصاب سے خارج کر دی گئی اور پھر اسی کے ساتھ ساتھ جوں جوں زمانہ گزرتا گیا قدرتی طور پر مسلمانوں کے دلوں سے انگریز کی نفرت بھی کم ہوتی گئی، جس کا نتیجہ یہ نکلا کہ مسلمان انگریزی تعلیم پر متوجہ ہونے لگے اور رفتہ رفتہ غصہ و نفرت کی خلیج کم سے کم ہوتی چلی گئی۔

دینی مدارس کا نصابِ تعلیم

اہم رائیں اور مشورے

دارالعلوم سبیل السلام حیدرآباد اپنے قیام کے وقت سے ہی چاہتا رہا ہے کہ بدلے ہوئے حالات میں دینی مدارس کے مروجہ نصابِ تعلیم پر اہلِ فکر و نظر اجتماعی طور پر غور و خوض کریں تاکہ کوئی واضح نتیجہ اور صحیح صورتِ حال سامنے آسکے۔ اور مرتبہ نصابِ تعلیم میں عمومی حیثیت سے زیادہ سے زیادہ "رجالِ کار" تیار کرنے کی صلاحیت پیدا ہو، اس وقت ہندوستان میں دینی تعلیم کے اشاعت کے سلسلہ میں جو حلقے کام کر رہے ہیں وہ راقم الحروف کے نظر میں بنیادی طور پر دو ہیں، دارالعلوم دیوبند، مظاہر علوم سہارنپور، دارالعلوم ندوۃ العلماء لکھنؤ، تحریک اسلامی ہند، مدرسۃ الاصلاح سرائے میر و بر فکر مولانا حمید الدین فراہیؒ اہلِ حدیث، متبعین مولانا احمد رضا خاں بریلوی، جامعہ نظامیہ حیدرآباد، معہد ملت مالیگاؤں و بر فکر مولانا عبدالحمید نعمانیؒ اور بہار مدارس اکزامینشن بورڈ ——— ان دو کی فکر ہی ہے جو ہندوستان کے دینی مدارس میں کام کر رہی ہے، کہیں یہ فکر مخصوص علاقے میں ہے اور کہیں پورے ہندوستان میں اس کا اثر ہے۔ خصوصیت کے ساتھ دارالعلوم دیوبند، مظاہر علوم سہارنپور اور دارالعلوم ندوۃ العلماء لکھنؤ کی فکر کا اثر ہندوستان کے پورے علاقوں میں ہے، ان میں بھی

دارالعلوم دیوبند کا اثر سب سے زیادہ ہے۔ دارالعلوم سبیل السلام نے اس سلسلہ میں کسی اجتماع کو تو طلب نہیں کیا البتہ ان دس حلقوں کے مدارس اور ان سے وابستہ ماہرینِ تعلیم اور تجربہ کار اساتذہ و مدرسین سے تحریری آراء طلب کی۔ یہ بات قابلِ اطمینان رہی کہ اکثر حضرات نے اس مسئلہ کی اہمیت کو محسوس کرتے ہوئے اپنی تفصیلی آراء سے مطلع کیا۔ دارالعلوم سبیل السلام کی جانب سے اس "مہم" کے ذمہ دار مولانا خالد سیف اللہ رحمانی (صدر المدرسین) متعین ہوئے جو اپنی صلاحیت و صالحیت اور ذوقِ تصنیف و تالیف کے اعتبار سے اہلِ علم و قلم کے حلقے میں مشہور و معروف ہیں، مولانا رحمانی نے ان تفصیلی آراء کی جو تلخیص تیار فرمائی تھی وہ زیرِ نظر رسالہ کے موضوع کی مناسبت سے ذیل میں پیش ہے، نصاب کے موضوع پر سوچتے ہوئے انشاء اللہ اس سے بڑی مدد ملے گی۔

محمد رضوان القاسمی

"نصابِ تعلیم کا مسئلہ ایک ایسا عمومی مسئلہ ہے جس میں مختلف دینی مدارس باہم مربوط بھی ہیں اور یہ بات بھی ضروری ہے کہ اس کیلئے زیادہ سے زیادہ اہلِ علم، ماہرینِ تدریس اور مختلف مکاتبِ تعلیم کی آراء کو سامنے رکھ کر ان سے استفادہ کیا جائے اور اس باب میں وسیع الفکری اور بے تعصبی کو اپنایا جائے، البتہ خواہ مخواہ آزمودہ ڈگر سے انحراف کی راہ بھی اختیار نہ کی جائے۔ چنانچہ مسئلہ کی اسی نزاکت کو سامنے رکھتے ہوئے ۲۵ محرم ۱۴۱۰ھ کو مدرسہ کے ناظم حضرت مولانا محمد رضوان القاسمی نے

اپنی ایک تحریر کے ذریعہ مدرسہ کے ممتاز اساتذہ پر مشتمل ایک کمیٹی بنائی اور راقم الحروف کو اس کا کنوینر مقرر کیا، چنانچہ راقم سطور نے مدرسہ ہذا کے تمام اساتذہ کے علاوہ ریاست اور ملک کے ممتاز علماء اور ماہرین تدریس کو اس سلسلے میں خطوط لکھے، مدرسہ کا جاریہ نصاب بھیجا اور ان سے خواہش کی کہ وہ اپنی گرانقدر آراء سے استفادہ کا موقع دیں۔ چنانچہ ملک کے مختلف اہل علم نے نہ صرف اپنی رائیں بھیجیں بلکہ اس طریقہ کار کی تحسین بھی فرمائی۔ جو رائیں موصول ہوئی ہیں ان میں مولانا سید انظر شاہ کشمیری شیخ الحدیث دارالعلوم (وقف) دیوبند، مولانا شمس الحق صاحب شیخ الحدیث جامعہ رحمانی مونگیر (بہار) ڈاکٹر مقتدیٰ حسن ازہری شیخ الجامعہ سلفیہ بنارس، مولانا کبیر الدین صاحب شیخ الحدیث جامعہ دارالسلام عمرآباد، مولانا حبیب الرحمان صاحب شیخ الحدیث دارالعلوم حیدرآباد، مولانا سلمان حسنی ندوی استاذ حدیث دارالعلوم ندوۃ العلماء لکھنؤ، مولانا افضال الحق قاسمی اعظمی، مولانا محمد قاسم صاحب مظفرپوری شیخ الحدیث مدرسہ رحمانیہ سوپول دربھنگہ (بہار) مولانا مفتی فضیل الرحمٰن ہلال عثمانی جامعہ دارالسلام مالیر کوٹلہ پنجاب، مولانا خلیل الرحمٰن اعظمی جامعہ دارالسلام عمرآباد، مولانا مفتی محمد یحییٰ صاحب دارالعلوم حیدرآباد، مولانا نیاز احمد صاحب رحمانی، استاذ جامعہ رحمانی مونگیر، مولانا سعود عالم قاسمی ناظم شعبہ دینیات مسلم یونیورسٹی علی گڑھ، مولانا ڈاکٹر محسن عثمانی ندوی جواہر لال یونیورسٹی دہلی، مولانا سید شاہ صبغۃ اللہ صاحب بختیاری، معہد احسانی رائے چوٹی، مولانا صدر الحسن ندوی استاذ جامعہ اسلامیہ کاشف العلوم اورنگ آباد، مولانا مفتی امان اللہ قاسمی ناظم مدرسہ مدینۃ العلوم مریال گوڑہ،

اور مولانا عبدالستار صاحب قاسمی گنٹور کے علاوہ خود دارالعلوم سبیل السلام کے اساتذہ میں مولانا زبیر احمد قاسمی شیخ الحدیث (سابق)، مولانا عتیق الرحمٰن قاسمی مولانا فضل الرحمٰن قاسمی، مولانا برکت اللہ قاسمی، مولانا نورالعین اعظمی، مولانا خورشید انور ندوی اور مولانا عباس قاسمی شامل ہیں۔

ذیل میں ان حضرات کی آراء کا خلاصہ درج کیا جاتا ہے، جس سے آپ حضرات کو غور وفکر اور فیصلہ میں سہولت ہوگی ——— میں فن وار ان حضرات کی رائیں درج کر رہا ہوں تاکہ ایک نظر میں ایک فن سے متعلق مجوزہ کتب آجائیں۔

۱۔ تفسیر واصولِ تفسیر

مولانا سید انظر شاہ صاحب کی رائے ہے کہ تفسیر میں زمخشری اور اصولِ تفسیر میں البرہان اور الاتقان سے فائدہ اٹھایا جائے، مولانا سعود عالم قاسمی کا خیال ہے کہ سالِ ہفتم میں تفسیر کو خصوصی اہمیت دی جائے اور الاتقان کے ضروری مباحث پڑھا دئے جائیں، مولانا شمس الحق صاحب کی رائے ہے کہ العون الکبیر کی جگہ تلخیص الاتقان پڑھائی جائے، مولانا عتیق الرحمٰن صاحب کی رائے ہے العون الکبیر پنجم عربی میں پڑھائی جائے اور ششم عربی میں تلخیص الاتقان یا اصولِ تفسیر کی کوئی اور کتاب رکھی جائے، مولانا محمد قاسم مظفر پوری کا خیال ہے کہ تیسیر القرآن مرتبہ مولانا عبدالصمد رحمانیؒ کو داخلِ درس کئے جانے پر ضرور غور کیا جائے، مولانا محسن عثمانی ندوی کی رائے ہے کہ جلالین کے بجائے مختصر تفسیر ابن کثیر، شیخ ادریس صابونی نہ زیادہ مناسب ہے، مولانا خورشید انور ندوی نے بیضاوی کے ساتھ ابن کثیر اور کشاف کے کچھ حصوں کے پڑھانے کا مشورہ دیا ہے، نیز یہ کہ جلالین کے ساتھ "اعلاء ما من بہ الرحمٰن" کا کچھ حصہ بھی ضرور پڑھایا جائے۔

۲۔ حدیث واصولِ حدیث

اصولِ حدیث میں مولانا انظر شاہ کی رائے ہے کہ مقدمہ ابن صلاح داخلِ نصاب کی جائے،

نیز سخاوی کی فتح المغیث اور سیوطی کی تدریب الراوی بھی مہمات میں سے ہیں، مولانا کی رائے ہے کہ خود دورہ میں بھی صحاح ستہ کا انتخاب ہی پڑھایا جائے، مثلاً ابن ماجہ سے اتباع سنت کا باب، بخاری سے بدء الوحی، ایمان اور علم، مسلم کا مقدمہ اور کتاب الایمان پڑھایا جائے، ابوداؤد کی سند پر توجہ دی جائے۔ مولانا نیاز احمد رحمانی نے لکھا ہے کہ بخاری، مسلم، ترمذی، ابوداؤد اور طحاوی سبقاً سبقاً پڑھائی جائے، احادیث کی تمام کتابوں کا رکھنا کیا ضروری ہے؟ ڈاکٹر محسن عثمانی ندوی کی رائے ہے کہ دورۂ حدیث میں شیخ محمود طحان کی کتاب "مصطلح الحدیث" مناسب ہوگی، مولانا مسعود عالم قاسمی نے لکھا ہے کہ دورۂ حدیث میں ابوداؤد، نسائی، طحاوی اور ابن ماجہ کے منتخب ابواب کافی ہیں، البتہ مقدمہ ابن الصلاح، کتاب الکفایہ، تدریب الراوی، العلل المتناہیہ، المنار المنیف اور معرفۃ علوم الحدیث کے منتخب حصے پڑھا دیے جائیں، ہفتہ میں ایک گھنٹہ تخریج احادیث اور استنباط احکام کی مشق کرائی جائے، نیز حدیث کی انتیس انواع میں سے کسی ایک پر یا رجال پر، یا کسی محدث کے علمی کام پر ایک مفصل مقالہ لکھوایا جائے، مولانا صدر الحسن ندوی نے دورۂ حدیث میں ڈاکٹر مصطفیٰ صادق رافعی کی "السنۃ والمکانتہا فی التشریع الاسلامی" ڈاکٹر عجاج الخطیب کی "السنۃ قبل التدوین" اور ڈاکٹر مصطفیٰ اعظمی کی "دراسات فی حدیث النبوی" میں سے کسی کتاب کو خارجی مطالعہ کے لئے متعین کرنے کا مشورہ دیا ہے اور یہ بھی کہ جرح و تعدیل کے فن پر کوئی مختصر سی کتاب بھی اس جماعت میں شریک نصاب کی جائے، البتہ آپ کا خیال ہے کہ مقدمہ عربی میں "نخبۃ الفکر" کے ساتھ "مقدمہ شیخ عبد الحق کی ضرورت نہیں۔ مولانا عتیق الرحمٰن صاحب کی رائے ہے کہ دورۂ حدیث کے اندر صحیحین، ترمذی، اور ابوداؤد کی تکمیل کا انتظام ہو، نیز شریک درس دیگر کتابوں کا بھی معتد بہ حصہ پڑھایا جائے، مؤطائین اور شمائل ایک ہی گھنٹہ میں سال کے مختلف تین حصوں میں پڑھائی جائیں، مولانا حسیب الرحمٰن صاحب کی رائے ہے کہ طحاوی اور مؤطا امام محمد مکمل روایۃ نہیں بلکہ درایۃ ہی پڑھائی جائے۔

۴۔ فقہ اور اصول فقہ

مولانا انظر شاہ صاحب کی رائے ہے کہ کنز کے بجائے "ملتقی الابحر" اور "شرح وقایہ" کی جگہ "شرح نقایہ" داخل نصاب کی جائے، مولانا نیاز احمد رحمانی کی رائے ہے کہ "نور الایضاح" "الفقہ المیسر" سے زیادہ مناسب ہے۔

اور اس میں مسائل زیادہ ہیں۔ ڈاکٹر محسن عثمانی کی رائے ہے کہ ہفتم عربی میں سراجی کی جگہ "فوائد فی علم الفرائض" تالیف محمد عبدالرحیم جاد بدالدین زیادہ موزوں ہے۔ مولانا سعود عالم قاسمی نے ہشتم عربی میں ابن رشد کا "بدایۃ المجتہد" کے مختلف حصوں کے اضافہ کی رائے دی ہے۔ مولانا خلیل الرحمن لال بلیاوی نے "سراجی" کی جگہ "قوانین الوراثت فی الاسلام" کو زیادہ موزوں قرار دیا ہے۔ مولانا حبیب الرحمن صاحب نے "کنز" کی جگہ "شرح نقایہ" کو داخل نصاب کرنے کی رائے دی ہے اور لکھا ہے کہ قدوری مکمل پڑھائی جائے، مولانا عتیق الرحمن صاحب کی رائے ہے کہ "ہدایہ جلد اوّل" مکمل پڑھائی جائے، مولانا خورشید الوندوی کی رائے ہے کہ "کنز الدقائق" کی بجائے "قدوری" کے بعد بالترتیب "ہدایہ اولین، آخرین" اور ہفتم میں "الفقہ علی المذاہب الاربعہ" داخل نصاب کی جائے۔

اصول فقہ میں مولانا انظر شاہ نے "تاسیس النظر" کا مشورہ دیا ہے اور اس پر خصوصی توجہ دینے کو کہا ہے، مولانا محسن عثمانی نے "نور الانوار" کی جگہ "المدخل الی علم اصول الفقہ" (از ڈاکٹر معروف دوالیبی) یا "علم اصول الفقہ" (از شیخ عبدالوہاب خلاف) کی رائے دی ہے۔ مولانا کبیر الدین صاحب نے بھی "علم اصول الفقہ" کا مشورہ دیا ہے۔ مولانا صدر الحسن ندوی نے بھی بجائے "حسامی" کے اسی کتاب کو ترجیح دی ہے۔ مولانا مسعود عالم قاسمی نے سال ششم میں "الانصاف فی بیان سبب الاختلاف" کا مشورہ بھی دیا ہے۔ مولانا عتیق الرحمن صاحب کی رائے ہے کہ اصول الشاشی اور حسامی کے علاوہ دو سال میں مکمل "نور الانوار" پڑھا دی جائے، یا کسی ایک ایسی تسبتاً مختصر کتاب کا انتخاب کیا جائے جس میں قیاس و استحسان کی بحثیں آجائیں۔ مولانا قاسم صاحب مظفر پوری کے نزدیک بھی عبدالوہاب خلاف کی "علم اصول الفقہ" داخل نصاب کئے جانے کے لائق ہے۔ مولانا نور العین صاحب کی رائے ہے کہ "حسامی" سے سنت، اجماع اور قیاس کی بحثیں پڑھائی جائیں، یہی رائے مولانا نیاز احمد صاحب رحمانی کی بھی ہے، یا "حسامی" کی جگہ "علم اصول الفقہ" رکھ دی جائے۔ مولانا انظر شاہ کی رائے ہے کہ قواعد فقہ میں "الاشباہ والنظائر" بھی داخل نصاب ہو۔

۴۔ عقائد

مولانا انظر شاہ صاحب کی رائے ہے کہ عقائد میں "شاطبی" داخل نصاب کی جائے، مولانا محسن عثمانی کی رائے ہے کہ عقائد میں شاہ ولی اللہ صاحبؒ کی "العقیدۃ الحسنہ" مناسب ہے۔ مولانا شمس الحق صاحب نے

"العقیدۃ السنیہ" شرح مولانا اویس صاحب ندوی کا مشورہ دیا ہے۔ مولانا حبیب الرحمٰن صاحب کی رائے ہے کہ شرح عقائد میں عذاب قبر سے اخیر تک کے مباحث زیادہ ضروری ہیں، مولانا نور العین صاحب کی رائے ہے کہ شرح عقائد کے بجائے "العقیدۃ السنیہ" یا عقیدۃ الطحاوی داخل نصاب ہو، نیز شرح عقائد میں "الکلام صفۃ ازلیۃ" سے اختتام کتاب تک داخل نصاب ہو۔ مولانا اصدر الحسن ندوی نے "عقیدۃ الطحاوی" مع شرح ابو العز حنفی کا مشورہ دیا ہے، مولانا خورشید انور ندوی کی رائے ہے کہ عقیدۃ الطحاوی (متن) تنہا عقائد کے موضوع میں کافی ہے۔

۵۔ نحو و صرف

مولانا فضیل الرحمٰن عثمانی نے "معلم الصرف" "تبویب الصرف" "تعلیمات صرف" اور "معلم النحو" کا مشورہ دیا ہے۔ مولانا عتیق الرحمٰن صاحب کی رائے ہے کہ صرف میں "پنج گنج" اور "کتاب الصرف" یا اس طرح کی کوئی اور کتاب داخل درس ہو، "تسہیل الصرف" میں بہت طول ہے، اسلئے اسے نہ رکھا جائے، نحو میں بھی "مفتاح النحو" کی جگہ کسی اور کتاب کا انتخاب ہو، مولانا نور العین صاحب کی رائے ہے کہ "شرح مائۃ عامل" کی تدریسی نوعیت میں تبدیلی کی جائے۔ نیز نحو میں "نجم عربی" میں "شرح شذور الذہب" داخل نصاب کی جائے۔ مولانا زبیر احمد صاحب نے اصولی رائے دی ہے کہ ابتدائی صرف و نحو کی ایسی کتابیں ہوں، جن میں قواعد کے اجرا اور مشق و تمرین کا حصہ غالب ہو، مولانا محسن عثمانی نے "تمرین النحو" اور "تمرین الصرف" اور "کتاب النحو" و "کتاب الصرف" میں سے کسی ایک کا مشورہ دیا ہے اور "ہدایۃ النحو" کی جگہ "دروس اللغۃ العربیۃ" (شیخ مصطفےٰ غلایینی) کی رائے دی ہے، مولانا خورشید انور ندوی نے "ہدایۃ النحو" کے بعد "شرح شذور الذہب" کو نحو کی آخری کتاب کی حیثیت سے پڑھانے کا مشورہ دیا ہے، مفتی امان اللہ صاحب نے تسہیل الصرف (سوم) کی جگہ "علم الصیغہ" کو زیادہ مناسب قرار دیا ہے

۶۔ ادب عربی

مولانا محسن عثمانی کی رائے ہے کہ منہاج العربیہ کی جگہ "القراءۃ الواضحہ" دوم عربی میں

"قصص النبیین" اوّل و دوم، سوم عربی میں "القراءۃ الراشدۃ" اوّل کے ساتھ قصص النبیین سوم چہارم عربی میں "القراءۃ الراشدۃ" دوم کے ساتھ "قصص النبیین" کا آخری حصہ خاتم النبیین داخلِ نصاب ہے۔ مولانا شمس الحق صاحب نے لکھا ہے کہ "مقاماتِ حریری" نوائب کا مجموعہ ہے، اس کی جگہ "اخوان الصفا" یا "مستطرف" یا "منثورات" (از رابع ندوی) داخلِ درس کی جائے۔ مولانا صدر الحسن ندوی کے نزدیک بھی "مقامات" کی تدریس چنداں مفید نہیں، نظم میں آپ نے "متنبی" اور "حماسہ" کا مشورہ دیا ہے، تاریخ، ادب کی کسی مختصر کتاب اور ششم و ہفتم کی جماعتوں میں انشاء کے لئے مستقل گھنٹوں کی رائے دی ہے۔ ڈاکٹر مقتدیٰ حسن ازہری نے ادب عربی میں بعض کتابیں عرب مصنفین کی داخل کرنے کی رائے دی ہے، البتہ اس کی تعیین نہیں کی ہے، مولانا عتیق الرحمٰن صاحب نے "مقامات" کے بجائے "حماسہ" کا مشورہ دیا ہے مولانا قاسم مظفر پوری نے "دیوان متنبی" پر "حماسہ" کو ترجیح دی ہے اور لکھا ہے کہ کم از کم پانچسو اشعار حماسہ، مراثی اور ادب کے پڑھائے جائیں، مولانا کبیر الدین صاحب نے بھی "حماسہ" سے اشعار کے انتخاب کا مشورہ دیا ہے، مولانا نور العین صاحب نے "متنبی" کو داخلِ نصاب کئے جانے کا مشورہ دیا ہے، مولانا انظر شاہ نے "متنبی" اور "حماسہ" دونوں کے منتخب حصے داخلِ نصاب کرنے کو کہا ہے۔

۷۔ بلاغت

مولانا کبیر الدین صاحب اور مولانا محسن عثمانی اور مولانا صدر الحسن صاحب ندوی اور مفتی امان اللہ صاحب نے "البلاغۃ الواضحۃ" کا مشورہ دیا ہے۔ مولانا شمس الحق صاحب نے بھی "مختصر المعانی" کی جگہ "تذکرۃ البلاغۃ" یا "تدریس البلاغۃ" کی رائے دی ہے۔ مولانا حسیب الرحمٰن صاحب نے مختصر المعانی سے پہلے "دروس البلاغۃ" کی رائے دی ہے۔ مولانا عتیق الرحمٰن صاحب کی رائے ہے کہ "تلخیص المفتاح" اور "البلاغۃ الواضحۃ" داخلِ نصاب ہو۔ مولانا قاسم مظفر پوری نے "البلاغۃ الواضحۃ" پر "تلخیص المفتاح" کو ترجیح دی ہے۔ مولانا نور العین صاحب کا مشورہ "مختصر المعانی" کی جگہ "البلاغۃ الواضحۃ" کا ہے۔ مولانا برکت اللہ صاحب کا خیال ہے کہ پنجم عربی میں "البلاغۃ الواضحۃ" اور ششم عربی میں "مختصر المعانی" رکھی جائے۔

۸۔ منطق و فلسفہ

مولانا شمس الحق صاحب نے لکھا ہے کہ "مرقات" پڑھانے کے بعد "قطبی" کے "صرف" اور "قیاس" کی بحث کیوں نہ پڑھائی جائے؟ مولانا افضال الحق صاحب کی رائے ہے کہ "تیسیر المنطق" "مرقات" اور "شرح تہذیب" ناکافی ہے "سلم" تک منطق کی تعلیم ہو، مولانا برکت اللہ صاحب کی رائے ہے کہ تیسیر المنطق سوم عربی رکھی جائے تو مرقات کے سمجھنے میں سہولت ہوگی اور "ہدایۃ الحکمۃ" ششم عربی میں مناسب ہے۔ مولانا زین العابدین صاحب کا خیال ہے کہ "شرح تہذیب" کے بجائے "ہدایۃ الحکمۃ" ہونی چاہئے، مولانا صدر الحسن صاحب کی رائے ہے کہ منطقی اصطلاحات کے لئے صرف "تیسیر المنطق" ہی کافی ہے اور اس کو بھی جماعت پنجم میں رکھا جائے۔

۹۔ علوم عصریہ

اکثر حضرات دینی مدارس میں علوم عصریہ کے داخل کئے جانے کے حق میں ہیں، مولانا شمس الحق صاحب نے تاریخ، جغرافیہ اور انگریزی کے داخلِ نصاب کرنے پر زور دیا ہے، مولانا انظر شاہ صاحب نے سائنس، مدنیت اور تاریخ میں "تاریخ اسلام" "تاریخ ہند" اور "تاریخ عالم" کو بھی اہمیت دینے کی رائے دی ہے، مولانا نیاز احمد صاحب رحمانی نے خاص طور پر اکبر شاہ نجیب آبادی کی تاریخ کا ذکر کیا ہے، مولانا مسعود عالم قاسمی نے فلسفہ جدیدہ پر کسی مناسب کتاب کے اضافہ کی رائے دی ہے، سالِ پنجم میں موصوف کی رائے ہے کہ پولیٹیکل سائنس پر کوئی تعارفی کتاب رکھی جائے، نیز سالِ چہارم میں سیرت کی کتاب اور سالِ سوم میں تاریخ اسلام کی کوئی کتاب داخلِ نصاب ہو، مولانا عتیق الرحمٰن صاحب نے لکھا ہے کہ سائنس اور جغرافیہ کی تعلیم اس حد تک ضروری جائے کہ جس سے مبادیات اور اصطلاحات سے واقفیت ہو جائے۔ مولانا قاسم صاحب مظفر پوری کی رائے میں معاشیات، تمدن اور طبعیات کو مستقل طور پر داخلِ نصاب نہ کیا جائے، بلکہ اس کے ضروری عنوانات پر محاضرات ہوں، اور اس کا باضابطہ امتحان ہو، البتہ انگریزی کی ابتدائی ایک دو کتابیں پڑھادی جائیں، مولانا صدر الحسن ندوی نے بھی انگریزی کے علاوہ دوسرے عصری فنون میں صرف محاضرات ہی کا مشورہ دیا ہے۔

مولانا نیاز احمد صاحب رحمانی اور مفتی محمد یحییٰ صاحب علوم عصریہ کے داخل کیے جانے کے حق میں نہیں ہیں جب کہ مولانا عباس صاحب قاسمی کی رائے ہے کہ انگریزی کو ابتدائی درجات تک محدود نہ رکھا جائے، مفتی امان اللہ صاحب قاسمی کا خیال ہے کہ آندھرا پردیش میں تلگو زبان بھی ضرور داخل نصاب کی جائے۔

۱۰۔ خارجی مطالعہ

خارجی مطالعہ کے مجوزہ نصاب کی عام طور پر تحسین کی گئی ہے، مولانا محسن عثمانی ندوی نے جماعت چہارم میں "تاریخ اسلام" (شاہ معین الدین ندوی)، تاریخ دعوت وعزیمت دوم اور سوم، ششم عربی میں تاریخ دعوت وعزیمت، چہارم و پنجم، ہفتم عربی میں سیرت سید احمد شہید اول، دوم اور استاد محمود شاکری کی "حاضر العالم الاسلامی"، دورۂ حدیث میں نہایت کے بجائے اصل کتاب "السیرۃ النبویہ" اور "اسلام اور جدید شبہات" کی جگہ "شبہات حول الاسلام" رکھنے کی رائے دی ہے، جدید علم کلام پر موصوف نے "مذہب اور سائنس"، "اسلام و جدید معاشی نظام" "سود" "پردہ" اور "تنقیحات" کو شامل کرنے کی رائے دی ہے۔ مولانا مسعود عالم قاسمی کی رائے ہے کہ دورۂ حدیث میں السنۃ و مکانتہا فی التشریع الاسلامی" "تدوین حدیث" "سنت کی آئینی حیثیت" "الحدیث والمحدثون" سال ہفتم میں "ارض القرآن" "امثال القرآن" "اعجاز القرآن" "التفسیر والمفسرون، سال ششم میں "مصادر التشریع الاسلامی فیما لا نص فیہ" "فقہ الزکوٰۃ" "جدید فقہی مسائل" سال پنجم میں "السیرۃ النبویہ"، "الدعوۃ النبویہ"، "غزوۃ النبی" سال چہارم میں "تاریخ الخلفاء"، "تاریخ تمدن اسلامی" "تاریخ اسلامی ہند" "تاریخ اندلس" اور سال سوم میں "عبرات و نظرات" کا مشورہ دیا ہے، مولانا شمس الحق صاحب نے لکھا ہے کہ خارجی مطالعہ میں اردو نظم و نثر ہونی چاہیئے، مولانا عتیق الرحمٰن صاحب کی رائے ہے کہ البتہ مطالعہ کو آزاد نہ رکھا جائے، بلکہ ہر جماعت کو کسی استاذ سے مربوط کیا جائے اور امتحان سالانہ میں اس پر مستقل پرچہ ہو، مولانا قاسم صاحب نے سال چہارم میں "آئینہ تاریخ ہند" (جناب افضل حسین صاحب) کی رہنمائی کی ہے، چہارم عربی میں مولانا نور العین صاحب نے "مختصر تاریخ ہند" (مولانا ابوظفر ندوی) کی نشاندہی کی ہے اور لکھا ہے کہ سوم عربی میں "انسانی دنیا پر مسلمانوں کے عروج وزوال کا اثر"

معیار اور علمی سطح سے اونچی کتاب ہے۔

فارسی

مولانا برکت اللہ صاحب نے اوّل عربی میں "آمد نامہ" اور "کریما" اور بشرط سہولت "فارسی اوّل" دوم عربی میں "فارسی کا حصہ دوم" اور "گلزار دبستان" کا نصف حصہ اور سوم عربی میں "گلستان" رکھنے کی رائے دی ہے۔

تخصص فی الفقہ

تخصص فی الفقہ کے نصاب کی عام طور پر تحسین کی گئی ہے، اس نصاب کے بارے میں مولانا سلمان صاحب ندوی نے لکھا کہ سوائے تحسین کے اور کچھ نہیں کہتا۔ مولانا صدر الحسن ندوی کی رائے ہے کہ "نصاب اچھا اور معیاری ہے"۔ البتہ آپ کا مشورہ ہے کہ دو سال کی مدت میں صرف ایک ہی تحقیقی مقالہ طلبہ سے لکھوایا جائے۔ مولانا افضال الحق صاحب کی رائے ہے کہ مولانا عبد الحئی، مولانا گنگوہی اور مفتی کفایت اللہ کے فتاوی کا مطالعہ کرایا جائے اور تدوین فقہ کی اب تک کی تاریخ، تدریج اور ترتیب پر تحقیقات کرائی جائیں۔ مولانا فضیل الرحمن عثمانی نے "اسلامی دستاتین" (اردو) کو داخل نصاب کرنے کی رائے دی۔ مولانا قاسم صاحب کی رائے ہے کہ سورۂ بقرہ، نساء، نور، احزاب، طلاق، مجادلہ، وغیرہ سورتیں، جن میں آیات احکام زیادہ ہیں کا "احکام القرآن للجصاص" کے ساتھ مطالعہ کرایا جائے، نیز فقہ کی کسی کتاب کا از ابتدا تا انتہا مطالعہ کرایا جائے، تاکہ جملہ ابواب کا مسلسل مطالعہ ہو جائے۔ مولانا نور العین صاحب کی رائے ہے کہ "شرح رسم المفتی" کے ساتھ "شرح مہذب للنووی" کے مقدمہ اور آداب المفتی کا حصہ پڑھایا جائے۔ مولانا مفتی یحییٰ صاحب کی رائے ہے کہ تخصص کے طلبہ میں ایسی استعداد پیدا کی جائے کہ متقدمین اور متاخرین کی کتابوں سے مسائل کا استخراج کر سکیں۔

مختصر مدتی عالم کورس

اس کورس میں مولانا محسن عثمانی نے "معلم الانشاء" حصہ اوّل و دوم اور "منہاج العربیہ" کی جگہ

"القراءۃ الواضحۃ"، نیز قصص النبیین" اول تا پنجم داخل کرنے کی رائے دی ہے، مولانا سلمان صاحب کی رائے ہے کہ اس کورس میں "ہدایہ" و "بخاری" نہ رکھی جائے، بلکہ قرآن پاک، ترجمہ، مختصر تفسیر، مشکوٰۃ شریف اور "قدوری" پڑھائی جائے۔ نصاب تین سالہ ہو اور اس کورس کے لئے "عالم" کی اصطلاح استعمال نہ کی جائے۔ مولانا شمس الحق صاحب نے بھی اس کورس میں قرآن شریف کے مکمل ترجمہ اور کورس کو مختصر و آسان کرنے کی رائے دی ہے۔ مولانا حبیب الرحمٰن صاحب نے مشورہ دیا ہے کہ موجودہ زمانہ کے طلبہ کی ذہنی سطح و صلاحیت کو سامنے رکھ کر نصاب کا تعین کیا جائے اور مولانا قاسم صاحب نے بھی لکھا ہے کہ "جلالین" کے بجائے "ترجمہ قرآن" پر اکتفا کیا جائے۔ مولانا عبدالستار قاسمی گنٹور نے مختصر مدتی عالم کورس کے نصاب کو کافی قرار دیا ہے۔ مولانا کبیر الدین صاحب نے عالم کورس کا نصاب مرتب کیا ہے، اس کی قابل ذکر بات یہ ہے کہ آپ نے "اللغۃ العربیۃ للناطقین بہا" ڈاکٹر عبدالرحیم مدیر شعبۂ لغت عربیہ، جامعہ اسلامیہ مدینہ منورہ) کے تین حصوں کو دو سال میں پڑھانے کا مشورہ دیا ہے مولانا صدرالحسن ندوی نے چار سالہ نصاب تجویز کیا ہے، اور آپ کی رائے ہے کہ اصول فقہ کی کسی کتاب کی اس شعبہ میں ضرورت نہیں۔

متفرق لیکن اہم رائیں:

نصاب تعلیم اور نظام تعلیم کی عمومی کے سلسلہ میں مختلف اہل علم کی تحریروں میں بعض مفید آراء آگئی ہیں، ان کا خلاصہ ذکر کیا جاتا ہے۔

- مولانا انظر شاہ کشمیری کی رائے ہے کہ تمرین و ریاضت، اردو عربی تقریر اور عربی زبان میں باہمی گفتگو پر زور دیا جائے۔
- مولانا محسن عثمانی کی رائے ہے کہ مطلوبہ کتب دستیاب نہ ہوں تو فوٹو اسٹیٹ سے فائدہ اٹھایا جائے۔
- مولانا سلمان ندوی کی رائے ہے کہ جماعت حفظ ہی سے ہلکی پھلکی عربی زبان پڑھائی جائے تجوید، تلفظ اور عربی لہجہ پر زور دیا جائے اور ابتدائی دو تین سال میں قواعد کا بوجھ کم ہی رکھا جائے ——— نیز یہ کہ نصاب کے دو درجات کئے جائیں، نصاب ضروری اور

نصابِ فضل۔ نصابِ ضروری پنجم عربی پر مکمل ہو اور نصابِ فضل دورۂ حدیث پر مکمل ہو۔

• مولانا مسعود عالم صاحب قاسمی نے سالانہ "تدریب المعلمین" ہفتہ منعقد کرنے کی رائے دی ہے، جس میں دینی و عصری مدارس کے ماہرین شریک ہوں اور تعلیم کے نظام، طریقہ و نفسیات وغیرہ پر مذاکرہ و تبادلۂ خیال کریں۔

• ہندو بیرونِ ہند کے کسی ممتاز عالم و دانش ور یا ماہر فن کا توسیعی خطبہ ہو اور اونچے درجات کے طلبہ کے گروپ بنا دیے جائیں، ایک گروپ مواد اور حوالے کا تجزیہ کرے، دوسرا اسلوب اور طرزِ بیان کا اور تیسرا تقریر میں پیش کیے گئے نکات کا۔ پھر یہ اپنا حاصلِ تجزیہ کسی ذمہ دار استاذ کے سامنے پیش کرے۔

• مولانا افضال الحق صاحب نے بھی اہلِ فن کو بلانے اور ان کے خطبات کے اہتمام پر زور دیا ہے۔

• مولانا عتیق الرحمٰن صاحب کی رائے ہے کہ ابتدائی چند سالوں میں اردو املا نویسی اور انشا پردازی کے گھنٹے بھی ہوں ——— مولانا نور العین صاحب نے بھی اسی نوع کا مشورہ دیا ہے ——— اور مولانا عباس صاحب نے بھی۔

• مولانا برکت اللہ صاحب نے تجوید بہ روایت حفص کو ضروری قرار دینے کا مشورہ دیا ہے اور مولانا عباس صاحب نے بھی اس طرف توجہ دلائی ہے۔

• نصابِ تعلیم کے رہنما خطوط کی نشان دہی کرتے ہوئے مولانا مفتی محمد یحییٰ صاحب نے لکھا ہے کہ علومِ آلیہ کی کتابیں کم رکھی جائیں، علومِ عالیہ میں جو ابواب مشترک ہوں وہ کم از کم دو کتابوں میں درایۃً ہوں اور بقیہ میں روایۃً۔

• مولانا زبیر احمد صاحب نے بحیثیت مجموعی ایسی کتابوں کے انتخاب کا مشورہ دیا ہے، جن کا طرزِ بیان سہل، اسلوب شگفتہ اور فن پر زیادہ حاوی ہو۔

• مولانا موصوف اور مولانا قاسم صاحب مظفر پوری نے فنون کی کثرت، مضامین کے تنوع اور زبان کے بوجھ کو کم سے کم رکھنے کی تلقین کی ہے۔

• مولانا افضال الحق صاحب نے "تخصص فی القرآن" اور مولانا برکت اللہ صاحب نے انگریزی اور عربی زبان میں تخصص کی رائے دی ہے۔

مولانا صبغت اللہ صاحب بختیاری[1] نے اکابر سے ربط اور تصوف کے علمی و عملی پہلوؤں پر توجہ دینے کو فرمایا ہے۔"

(سہ ماہی "صفا" شمارہ ۹، ۱۹۹۰ء)

نوٹ:

دار العلوم سبیل السلام (بالا پور، عقب صلالہ بار کس حیدر آباد ۵۰۰۰۰۵) نے ان آراء اور مشوروں کو سامنے رکھتے ہوئے درسی و خارجی مطالعہ کے لئے اپنا ایک مستقل "نصابِ تعلیم" مرتب کیا ہے جو مطبوعہ ہے۔

---

[1] ان کی وفات ہو چکی، وہ تاریخ داں بھی تھے اور تاریخ ساز بھی، اللہ تعالیٰ انہیں اپنی جوارِ خاص میں جگہ عطا فرمائے۔

محمد رضوان القاسمی

دینی مدارس کی نصابی کتبِ فقہ پر ایک نظر

"فقہ" اسلامی تعلیمات کا عطر اور نچوڑ ہے، وہ قرآن مجید کا خلاصہ ہے، سنتِ رسول کی روح ہے، شریعت کے علمی مزاج و مذاق کا ترجمان ہے اور اسلامی زندگی کے لئے خضر طریق ہے، اسلئے دینی مدارس اور دینی تعلیم کے نصاب میں اس کی جو اہمیت اور ضرورت ہے وہ محتاجِ اظہار نہیں، بزرگوں نے اسی لئے نصاب میں فقہ کو خاص اہمیت دی ہے اور ابتدائی جماعتوں سے لے کر انتہائی مرحلہ تک ہر جگہ اس کا حصہ رکھا ہے ـــــ ذیل کی سطور میں انہیں نصابی کتب کا تعارف کرایا جاتا ہے، تاکہ ان کی علمی اور فقہی اہمیت کا اندازہ ہو سکے۔

ھدایہ

ان میں سب سے اہم کتاب "ہدایہ" ہے ـــــ یہ کتاب برہان الدین ابوالحسن علی مولود ۵۱۱ھ رجب ۵۱۱ھ متوفی ۱۳ ذوالحجہ ۵۹۳ھ یا ۵۹۶ھ متوطن مرغینان کی ہے، صاحب "الجواہر المضیئہ" نے مصنف کے اوصاف و کمالات کا جو نقشہ کھینچا ہے، وہ یوں ہے:

کان اماما فقیها حافظا محدثا مفسرا جامعا	آپ امام فقیہ حافظ محدث علوم کے جامع مختلف فنون کے
لعلوم ضابطا للفنون متقنا محققا ناقدا مدققا	ضابط، معتبر، محقق، ناقد، باریک بین، زاہد، متورع، ماہر،
زاهدا ورعا بارعا فاضلا ماهرا اصولیا ادیبا	فاضل، اصول، ادیب اور شاعر تھے، علم و ادب میں
شاعرا لم تر العیون مثله فی العلم والادب[1]	آنکھوں نے ان کی نظیر نہیں دیکھی۔

---

(۱) الجواہر المضیئہ۔

اپنے عہد کے تمام باکمال مشائخ و علماء سے استفادہ کیا اور خود اپنے دامنِ تربیت سے بڑے بڑے اہلِ علم کو وجود بخشا۔ بعضوں نے آپ کو "اصحابِ ترجیح" میں اور بعضوں نے "مجتہدین فی المذہب" کے زمرہ میں رکھا ہے۔

آپ نے ابتداءً امام قدوری کی "مختصر" اور امام محمد کی "الجامع الصغیر" دونوں کو ملا کر ایک جامع متن تیار کیا اور اس کا نام "بدایۃ المبتدی" رکھا، پھر خود ہی ہدایہ کے نام سے اس کی شرح فرمائی اور طاش کبریٰ زادہ کے بیان کے مطابق اولاً اسّی جلدوں میں "کفایۃ المنتہی" کے نام سے شرح کی، پھر ہدایہ کی صورت میں اس کی تلخیص کی، اس کتاب میں گو فقہی جزئیات کا احاطہ نہیں اور بمقابلہ فتاویٰ کی دوسری مبسوط کتابوں کے مسائل کم ہیں، مگر مصنف نے احکام کے دلائل اور فقہی اختلافات پر جس ذہانت، اعلیٰ درجہ کی ذکاوت، زبردست قوتِ استدلال اور قیاس کی غیر معمولی صلاحیت سے کام لیا ہے، نیز جس درجہ ایجاز و اختصار سے اپنی بات کہی ہے اور اغلاق مخل کے بغیر مختصر ترین تعبیر میں اپنی بات کہہ دی ہے، وہ مصنف ہی کا حصہ ہے اور شاید اسلام کے فقہی کتب خانہ میں اس کی کوئی نظیر نہ ہو۔

ہدایہ کی انہیں غیر معمولی خصوصیات کے باعث وہ درس کی مقبول ترین اور بے بدل کتاب رہی ہے اور طالب علم میں جو جوہرِ فکر اور وقتِ نظر پیدا کرتی ہے اور استدلال کی قوت بہم پہونچاتی ہے، اس کا جواب نہیں۔ اسی لئے مولانا انور شاہ کشمیریؒ جیسے صاحبِ نظر عالم کا بیان ہے کہ میں "فتح القدیر" جیسی کتاب تو لکھ سکتا ہوں، لیکن "ہدایہ" کے طرز کی کتاب نہیں لکھ سکتا۔ جن لوگوں کو علامہ کشمیریؒ کے علمی مقام کا اندازہ ہے وہ بخوبی اس جملہ کا وزن محسوس کر سکتے ہیں۔

صاحبِ ہدایہ کی کمال ذہانت کے باوجود کتاب کا یہ پہلو قابلِ توجہ ہے کہ ہدایہ میں بہت سی ضعیف روایات کو جگہ مل گئی ہے اور جن مسائل میں نصوص موجود ہیں وہاں بھی مصنف نے قیاس سے ذکر کرنے پر اکتفا کیا ہے۔ اسی طرح بہت سی روایات ہیں کہ ہدایہ کی احادیث کی تخریج کرنے والوں کو کہنا پڑا کہ یہ حدیث نہیں ملتی ہے، خود شیخ عبدالحق محدث دہلوی رحمۃ اللہ علیہ کا بیان ہے:

مصنف وے در اکثر بناء کار بر دلیل معقول — اکثر مصنف اکثر مسائل میں دلیل و معقول پر بنیاد رکھتے ہیں[1]

---

(۱) مفتاح السعادۃ، ۲۵، ص ۱۲۸۔

عبادہ واگر حدیثے آوردہ نزد محدثین خالی از ضعفے نہ کوئی حدیث لاتے ہیں، تو وہ بھی ایسی جو محدثین کے نزدیک
غالباً اشتغال گوں استاد در علم حدیث کتر بودہ ضعف سے خالی نہیں ہوتی۔ غالباً علم حدیث سے ان کو کم
است[1]! اشتغال تھا۔

البتہ ابن ہمام نے "فتح القدیر"، زیلعی نے "نصب الرایہ" اور حافظ قاسم بن قطلوبغا نے "منیۃ الالمعی فی ما فات من تخریج احادیث الہدایہ للزیلعی" کے ذریعہ اس کمی کی تلافی کردی ہے ——— بعض مقامات پر نقل مذاہب وغیرہ میں بھی سہو ہوگیا ہے، جس کو مولانا عبدالحی لکھنوی نے "الہدایہ فی مقدمۃ الہدایہ" میں جمع کردیا ہے۔

ہدایہ کی گوناگوں خوبیوں کی وجہ سے یہ کتاب شروع ہی سے علماء اور مصنفین کی توجہ کا مرکز رہی ہے اور کثرت سے اس کی شروح و حواشی لکھے گئے ہیں اور احادیث کی تخریج کی گئی ہے، ان کی تعداد بیسیوں ہے، لیکن ان تمام شروح میں علامہ ابن ہمام (م ۸۶۱ھ) کی "فتح القدیر" اور علامہ زیلعی (م ۷۶۲ھ) کی تخریج "نصب الرایہ" کا خاص پایہ و مقام ہے۔

کنز الدقائق

ہمارے درس نظامی کی مروج کتب فقہ میں دوسری کتاب "کنز الدقائق" ہے، اس کے مصنف حافظ الدین ابوالبرکات عبداللہ بن احمد نسفی (متوفی ۷۱۰ھ) ہیں، یہ فقہ حنفی کی مستند و معتبر متون میں ہے، مسائل کا خاصا احاطہ و استیعاب ہے، مصنف نے انہیں اقوال و آراء کو نقل کرنے کا اہتمام کیا ہے جو "ظاہر روایت" کے مطابق ہیں۔ اس کی طرف خود ابن نجیم مصری نے اشارہ کیا ہے، لانہ موضوع لظاہر الہدایۃ۔ (البحر الرائق، ج ۷، ص ۲۳۲)

کسی کتاب کا درجہ اس کے مصنف کے علمی مقام سے متعین ہوا کرتا ہے، اس میں شبہ نہیں کہ صاحب کنز فقیہ، جامع العلوم اور بڑے ذہین و زیرک اہل علم میں تھے، اسی لئے بعض لوگوں نے آپ کو "مجتہد فی المذہب" تک قرار دیا ہے، مگر اس پر اتفاق نہیں۔ قدیم علماء کے یہاں جیسی اور جامع و مانع متن کی ترتیب ایک

---

[1] شرح سفر السعادۃ ۱۲۳

خاص فن کا درجہ رکھتی تھی، جس میں کمال ایجاز کے ساتھ زیادہ سے زیادہ مضامین کو سمیٹ لیا جاتا تھا، یہ ایک مشکل فن تھا، اس کے لئے مسائل پر گہری نظر، الفاظ و تعبیرات کے انتخاب کی غیر معمولی صلاحیت، نیز ذکاوت مطلوب ہوتی تھی، نسفی کے اندر یہ تمام صفات بدرجہ اتم موجود تھیں، اس لئے ان کی متون کو جو قبول عام حاصل ہوا اور اہل علم اور اصحاب تالیف کی توجہ جتنی آئی بہت کم مصنفین اس میں ان کے ہم پلہ ہو سکے ——— فقہ میں کنز الدقائق کے علاوہ "وافی" اصول فقہ میں "المنار" اور تفسیر میں "مدارک التنزیل" آپ کی ایسی ہی متون ہیں۔

کنز الدقائق کے بارے میں بعض اہل علم کا خیال ہے کہ یہ مستقل کتاب نہیں، بلکہ فقہ کے موضوع پر نوٹس اور یادداشتیں تھیں، جن کو اہل علم زبانی یاد کر لیا کرتے تھے، واقعہ بھی ایسا ہی معلوم ہوتا ہے۔ اس کی وجہ سے کتاب میں اکثر مواقع پر "ایجاز" کی بجائے "اغلاق" پیدا ہو گیا ہے، کہیں کہیں تو صرف رمزیات ہیں اور صرف "حروف" سے جملوں کی طرف اشارہ کر دیا گیا ہے، اس کی وجہ سے فن سے مناسبت کم پیدا ہوتی ہے اور نقلی موشگافی زیادہ، طلبہ کی ذہنی قوت صرف حل الفاظ میں کھو کر رہ جاتی ہے، اسلئے خیال ہوتا ہے کہ نصاب درس کے لئے یہ کچھ زیادہ موزوں کتاب نہیں ہے۔ واللہ اعلم۔

جیسا کہ مذکور ہوا، علامہ نسفی کی اس کتاب پر بھی شارحین کی خاص نگاہ کرم رہا ہے اور دسیوں شروح اس کی لکھی گئی ہیں، تاہم زیلعی کی "تبیین الحقائق" اور ابن نجیم مصری کی "البحر الرائق" اس کی عظیم الشان شرحیں ہیں "تبیین" میں زیادہ توجہ دلائل پر ہے اور "بحر" میں جزئیات کے احاطہ و استیعاب پر ——— یہی نقطۂ نظر سے کنز کا وہ حاشیہ نہایت کامیاب اور مفید ہے جو حالیہ قریبے علماء میں مولانا محمد احسن نانوتوی نے تحریر فرمایا ہے اور ہندوستان میں مطبوعہ کنز الدقائق کے ساتھ طبع ہوا ہے۔

شرح وقایہ

ہماری درسیات کی فقہی کتب میں تیسری کتاب "شرح وقایہ" ہے۔ "وقایہ" تاج الشریعہ محمود کا ایک نہایت مقبول متن ہے، مصنف کے پوتے صدر الشریعہ الاصغر عبید اللہ بن مسعود نے اس کی شرح فرمائی ہے یہی "شرح وقایہ" سے موسوم و معروف ہے۔ صدر الشریعہ کا خانوادہ ایک خاص علمی اور فقہی خانوادہ تھا، تاج الشریعہ کے والد صدر الشریعہ الاکبر احمد بن جمال الدین ابی المکارم بھی بڑے علماء میں تھے،

جن کا سلسلۂ نسب مشہور صحابی حضرت عبادہ بن صامتؓ سے ملتا ہے۔ شارح وقایہ کے سنہ وفات میں اختلاف ہے، عام خیال ہے کہ آپ کی وفات ۷۴۳ھ میں ہوئی، آپ نے جہاں وقایہ کی شرح لکھی ہے، وہیں "نقایہ" کے نام سے اس کی تلخیص بھی کی ہے، اصول پر تنقیح اور پھر اس کی شرح توضیح کے نام سے کی، اس کی شرح علامہ سعد الدین تفتازانی نے "التلویح" کے نام سے لکھی، جو علمی دنیا میں محتاج تعارف نہیں۔

شارح وقایہ کو فقہ و اصول اور معقولات دونوں سے مناسبت تامہ تھی، "شرح وقایہ" ان کی شاہکار تصنیف ہے، البتہ یہ ایک حقیقت ہے کہ شرح میں بہت سے مقامات پر طول لاطائل نظر آتا ہے، مفتی بہ اور راجح اقوال کے نقل کرنے کا اہتمام نہیں ہے، طرز بیان میں تعقید ہے، بعض مقامات پر معقولی اصطلاحات کا استعمال ہے، حالانکہ اس سے بچنا ممکن ہے، انہیں وجوہ کی بنا پر اس کتاب کو اس درجہ اعتبار و استناد حاصل نہ ہو سکا جو "قدوری" و ہدایہ وغیرہ کو حاصل ہے۔

شرح وقایہ پر درجنوں مکمل و نامکمل حواشی لکھے گئے ہیں، لیکن غالباً سب سے مکمل اور جامع حاشیہ حضرت مولانا عبد الحئی فرنگی محلی کا ہے، جو "عمدۃ الرعایۃ" سے موسوم ہے۔ مولانا لکھنویؒ ہی نے اس کی ایک شایانِ شان مبسوط شرح بھی "السعایہ" کے نام سے لکھنی شروع کی تھی، جو نامکمل رہی، اگر یہ شرح مکمل ہو جاتی تو نہایت قیمتی چیز ہوتی اور گنج گرانمایہ ثابت ہوتی۔

مختصر قدوری

اس سلسلہ کی ایک ممتاز کتاب امام ابو الحسین احمد بن محمد قدوری متوفی ۵ رجب ۴۲۸ھ کی "المختصر" ہے، جو خود مصنف کی نسبت قدوری سے معروف ہے ——— امام قدوری ایک واسطہ سے جعفاؒ دو واسطوں سے کرخی اور پانچ واسطوں سے خود امام محمدؒ کے شاگرد تھے، اہل علم فقہ کی طرح حدیث میں بھی آپ کے پایۂ بلند کے معترف تھے۔ اصحاب انصاف کا خیال ہے کہ آپ کا شمار فقہا کے طبقۂ سوم میں ہونا چاہئے، امام قدوری کے قلم فیض رقم سے متعدد فقہی کتب وجود میں آئیں، انہیں میں "تجرید" "مسائل الخلاف" "تقریب" "مختصر کرخی" اور "ادب القاضی" کی شرحیں ہیں۔ لیکن جو کتاب سب سے زیادہ چشمانِ عقیدت کا سرمہ بنی وہ یہی "مختصر" ہے، اس کی مقبولیت کا حال یہ ہے کہ بہ قول صاحب "مفتاح السعادۃ" لوگ طاعون کی وبا اور مصائب میں اس کو از راہ تبرک پڑھا کرتے تھے۔

اس کتاب کا متن نہایت واضح، سلیس، مرتب اور مستند ہے اور اسی لئے فتاوی کے لئے اس متن کو معتبر مانا گیا ہے۔ اگر کہا جائے کہ درسیات میں متداول تمام متون میں اس کا پایہ بلند ہے اور اپنی سلاست اور فی افادیت کے استمرار سے لاجواب ہے تو ہرگز مبالغہ نہ ہوگا ـــــ بہت سے اہل علم نے اس اہم کتاب کی شرح وتحشیہ پر قلم اٹھایا ہے، جن میں امام قاسم بن قطلوبغا اور اسماعیل بن حسین بیہقی جیسے نادرۂ روزگار فقہا، ومحدثین بھی ہیں، ان میں ہدایہ اور ابوبکر بن علی حدادی کی السراج الوہاج اور الجوہرۃ النیرہ نے خاص قبول اور شہرہ حاصل کیا۔

واقعہ ہے کہ درسی نقطۂ نظر سے قدوری اور ہدایہ فقہ کی دو ایسی کتابیں ہیں کہ بظاہر اس کا کوئی بدل ممکن نہیں۔

نور الایضاح

یہ ابوالاخلاص حسن بن عمار شرنبلالی، متوفی ۱۰۶۹ھ کی تصنیف ہے۔ یہ خاص عبادات، طہارت صلوٰۃ، صوم، زکوٰۃ اور حج کے احکام پر مشتمل ہے، اس کتاب میں جزئیات وفروع کا خاصا اہتمام ہے، احکام کی ترتیب بھی اچھی ہے، لیکن بعض مقامات پر مسائل کے نقل کرنے میں سہو ہو گیا ہے، مثلاً سنن کو آداب یا آداب کو سنن کا درجہ دیدیا گیا ہے۔ اس طرح کی اور لغزشیں بھی ہیں، غسل اور استنجاء وغیرہ کے بعض مسائل بہت واضح اور کھلے لفظوں میں لکھے گئے ہیں اور اتفاق ہے کہ یہ کتاب فقہ کے بالکل ابتدائی اور کم عمر طلبہ کو پڑھائی جاتی ہے۔ اس لئے اس کی توضیح وتشریح میں حجاب آتا ہے اور بعید نہیں کہ اس کے اخلاقی اور نفسیاتی اثرات طلبہ قبول کریں۔

نور الایضاح کی سب سے جامع اور مبسوط شرح "مراقی الفلاح" اور "امداد الفتاح" ہے اور دونوں ہی مصنف کے قلم سے ہے، اول الذکر مطبوعہ ہے اور اس پر طحطاوی کے حاشیہ نے چار چاند لگا دیا ہے اور ثانی الذکر اب تک مخطوطہ ہے۔ کاش کوئی صاحب حوصلہ اس کی طباعت کا ذمہ لے۔

الفقہ المیسر

یہ حال کی تصنیف ہے، جو دار العلوم ندوۃ العلماء لکھنؤ کے کہنہ مشق اور مقبول استاذ

مولانا شفیق الرحمٰن ندوی کے قلم سے ہے اور ندوہ کے بانیان اوّل مولانا سید محمد علی مونگیریؒ اور علامہ شبلی نعمانیؒ نے اصلاحِ نصاب کی جس سعی کی داغ بیل ڈالی تھی اس کا ایک حصہ ہے، یہ نورالایضاح کا بدل ہے، عبادات کے احکام جمع کئے گئے ہیں، زبان نہایت رواں، سہل و عام فہم، طلبہ کی عمر کے مطابق اور ترتیب عمدہ ہے، احکام کا انتخاب بھی بڑی عمدگی کے ساتھ کیا گیا ہے۔ تمرینات بھی ہیں، کم سن طلبہ کے لئے جن مسائل کی ضرورت نہیں، اس کے ذکر یا بہت اظہار کے ساتھ ذکر سے گریز کیا گیا ہے۔ اس بات کی مستحق ہے کہ داخلِ نصاب کی جائے۔ مگر افسوس کہ فی زمانہ ذہنی تحفظات اور تنگنائیاں بعض مفید کتابوں کے قبول کئے جانے میں مانع ہو جاتی ہیں۔

اصولِ فقہ

"اصولِ فقہ" ــــ اسلامی علوم میں ایک اہم فن ہے جس کے ذریعہ اخذ و استنباط کے اصول اور اجتہاد کے قواعد معلوم ہوتے ہیں، گویا فقہ و اجتہاد کے لئے یہ ریڑھ کی ہڈی کا درجہ رکھتا ہے، فقہ و قانون کی تاریخ میں یہ ایک ایسا فن ہے کہ جس کی ایجاد اور تدوین و ترتیب میں علماء اسلام کو اوّلیت حاصل ہے۔ ہندوستان کے دینی مدارس کے قدیم مروج نصاب میں اصول فقہ کا حصہ نسبتاً زیادہ تھا اور "التوضیح والتلویح" نیز "مسلم الثبوت" بھی پڑھائی جاتی تھی، موجودہ نصاب میں بالعموم تین کتابیں پڑھائی جاتی ہیں، منتخب حسامی، نورالانوار اور اصول الشاشی۔

منتخب حسامی

"منتخب" جو مصنف کی طرف منسوب ہو کر "حسامی" ہی کے نام سے مشہور ہے، حسام الدین ابو عبداللہ محمد بن محمد متوفی ۶۴۴ھ کی تصنیف ہے، آپ کے پایۂ علمی کے لئے تنہا یہ کتاب کافی ہے، کتاب احناف کے مسلک اور انہیں کے اصول پر ہے، ایجاز و اختصار میں اپنی مثال آپ ہے، بلکہ کہیں کہیں اغلاق پیدا ہو جاتا ہے، کتاب میں تمام مباحث پر شرح و بسط سے گفتگو کی گئی ہے، قیاس، عوارض اہلیت اور عنصر مآخذ پر نسبتاً زیادہ مفصل کلام ہے اور اس لحاظ سے یہ اصول فقہ کی نصابی کتابوں میں ایک خاص درجہ و منزلت کی حامل ہے۔ متعدد شروح اس متن کی بھی لکھی گئی ہیں، جن میں شیخ عبدالعزیز بن احمد بخاری کی "التحقیق" خصوصیت سے

قابل ذکر ہے۔ علماء ہند نے بھی اس کتاب کی کافی اہمیت محسوس کی ہے۔ مولانا معین الدین دہلوی اور مولانا فیض الحسن گنگوہی نے حواشی لکھے ہیں، مولانا برکت اللہ لکھنوی نے "تعلیم العامی" اور شیخ ابو محمد عبدالحق دہلوی نے "نامی" کے نام سے شرحیں کی ہیں اور یہی آخر الذکر ان دونوں زیادہ متداول ہے۔

نورالانوار

قصبہ اسیٹھی میں پیدا ہونے والے مشاہیر میں احمد بن ابوسعید ہیں، جو ملا جیون کے نام سے معروف ہیں۔ ۱۰۴۸ھ میں پیدا ہوئے اور ۱۱۳۰ھ میں وفات پائی، ہندوستان کے اکابر علماء میں ہیں، طالب علمی ہی میں "التفسیرات الاحمدیہ" مرتب کی جس میں قرآن مجید کے فقہی احکام جمع کئے اور اس ذیل میں تقریباً پانچ سو آیات کی تفسیر فرمائی، دوسرے علماء کے علاوہ خود اورنگ زیب عالمگیرؒ نے بھی آپ کے سامنے زانوئے تلمذ تہ کئے۔ "نورالانوار" آپ ہی کی مایۂ ناز تالیف ہے۔

یہ حافظ ابوالبرکات عبداللہ بن احمد نسفی صاحب کنزالدقائق کی "منارالانوار" کی شرح ہے، اور منار کی مکمل اور مبسوط شرح ہے، ماتن کے مسامحات پر تنبیہ بھی ہے، شبہات کا حل بھی ہے، اصول کی تقریبات کے ذریعہ منقح بھی کیا گیا ہے اور تمام ہی اصول پر یکسانیت کے ساتھ بحث ہے، البتہ یہ ایک حقیقت ہے کہ فن پر بحث کی بجائے بعض جگہ نقلی بحث بہت طول پکڑ لیتی ہے اور اصل مقصد پس منظر میں چلا جاتا ہے، تمہیدی مباحث اور کتاب اللہ کا حصہ اتنا طویل ہے کہ اساتذہ و طلبہ کا پورا سال اسی میں تمام ہو جاتا ہے، اور بعض اساسی مباحث زیر تعلیم آنے سے رہ جاتے ہیں۔

اصول الشاشی

اصول فقہ کی بنیادی کتاب ہے، تفریعات پر زیادہ زور ہے، قواعد نسبتاً کم ہیں کتاب اللہ اور خود عربی زبان سے متعلق اصول کا حصہ کافی طویل ہے، سنت، اجماع اور قیاس کے ابواب سرسری ہیں، استحسان اور دوسرے مبنی ماخذ پر کوئی گفتگو نہیں کی گئی ہے۔ درس کی ابتدائی کتاب کے لحاظ سے یہ نہایت موزوں اور مفید کتاب ہے ——— خود مصنف نے اپنا نام نہیں لکھا ہے اس لئے مصنف کے بارے میں اہل تحقیق کے درمیان اختلاف ہے، بعض نے ابراہیم بن اسحاق شاشی

سمرقندی، متوفی ۵۳۹ھ اور بعضوں نے نظام الدین شاشی قرار دیا ہے۔

یہ کتاب "کتاب الحسین" سے بھی موسوم ہے کہ اس کے مصنف نے پچاس سال کی عمر میں، یا پچاس دنوں میں یہ کتاب لکھی تھی۔

چند ضروری نکات

ہر چند کہ ہمارے مروجہ نصاب میں فقہ کو خاص اہمیت دی گئی ہے جو اس کا حق ہے، لیکن چند نکات ہیں جو ابھی بھی لائق توجہ ہیں اور ضروری ہے کہ دینی مدارس اور علماء اس طرف خاص التفات فرمائیں

① تدوین نو کی ضرورت

اوّل یہ کہ جدید حالات اور تغیر پذیر اقدار نے جو نئے مسائل پیدا کر دیے ہیں، ظاہر ہے کہ ان کتابوں میں ان کی بابت واضح رہنمائی نہیں ملتی، ضرورت اس بات کی ہے کہ فقہ کی تدوین نو ہو، جدید قانونی ترتیب پر احکام مرتب کئے جائیں، ہر باب سے متعلق ایسے نئے مسائل پر بحث کی جائے اور انتصاف کے ساتھ اسباب وجوہ پر بھی روشنی ڈالی جائے جہاں احکام میں کوئی تبدیلی قبول کی جائے وہاں اس طرح توضیح و تشریح کی جائے کہ ظاہر تغیر پذیر اور ناقابل تغیر نصوص و اجتہادی احکام میں فرق کر سکیں۔ جب تک اس طرح کی کوئی مستقل کتاب مرتب نہیں ہوتی، ایسا کیا جا سکتا ہے کہ قدوری ہی وغیرہ کے ساتھ ایسے مسائل کا اضافہ کر دیا جائے۔ اس طرح ہم تعلیم فقہ کی ایک بڑی خامی کو دور کر سکتے ہیں۔

② طریق تعلیم کی اصلاح

دوسری اہم چیز طریقۂ تدریس کی اصلاح اور اس میں مناسب تبدیلی ہے، ہمارے یہاں تدریس میں صورت حال یہ ہے کہ کتاب تفسیر و حدیث کی ہو، فقہ کی ہو، زبان و ادب کی ہو، استاذ اس کو ایک ہی ڈھنگ سے پڑھاتے ہیں۔ حدیث اس طرح پڑھائی جاتی ہے کہ گویا وہ فقہ کی کوئی کتاب پڑھا رہا ہے، کتاب فقہ کی ہے، مگر اصل لغات اور ربط آیات کی طرح ابواب و فصول میں ربط و مناسبت کی بحثیں کبھی اس طرح کی جاتی ہیں، کہ فقہ سے ان کا کوئی رشتہ نظر نہیں آتا۔

ضرورت اس بات کی ہے کہ کتب فقہیہ پڑھاتے ہوئے ہر باب کے قواعد و کلیات طلبہ کو ذہن نشین کرائے جائیں، پھر جو مسائل مذکور ہیں، ان کا ان کلیات پر انطباق کرایا جائے، جس مسئلہ کے تحت کوئی جدید مسئلہ آسکتا ہو، مدرس اپنے ذوق سے اس پر روشنی ڈالے، وقتاً فوقتاً ایسے مسائل پر پہلے خود طلبہ سے استفسار کیا جائے، تاکہ ان میں نئے مسائل پر غور کرنے اور سوچنے کی صلاحیت پیدا ہو۔

③ اصول فقہ کی طرف خصوصی توجہ کی ضرورت

تیسری اہم ضرورت اصول فقہ کی تعلیم کی طرف مزید توجہ والتفات ہے۔ اصول فقہ کی جو کتابیں اس وقت مدارس میں داخل نصاب ہیں وہ ناکافی ہیں، ان میں اکثر کتابوں کی تعبیر میں اس درجہ الجھاؤ اور اغلاق ہے کہ طلبہ کی ذہنی قوت کا بڑا حصہ لفظی موشگافیوں اور حل عبارت کی نذر ہو کر رہ جاتا ہے، بعض سہل التفہیم کتابیں ہیں تو ان میں مختلف مباحث کا احاطہ اور ان کی طرف توجہ و اعتبار میں توازن نہیں ہے، فقہ حنفی کے علاوہ دوسرے مذاہب فقہ کے اصول سے بھی برائے نام بحث کی گئی ہے۔

اس لئے ایک ایسی کتاب مطلوب ہے جو بیان و تعبیر کے اعتبار سے آسان ہو، فن پر مبنی ہو، تمام مباحث یکسانیت اور توازن کے ساتھ مذکور ہوں اور مختلف دبستان فقہ کے اصول کی جامع ہو ——— بحمداللہ ادھر بعض عرب مصنفین نے ان تمام خصائص و اوصاف کی رعایت کے ساتھ بعض کتابیں مرتب کی ہیں، جن میں ابوزہرہ کی "اصول الفقہ" اور عبدالوہاب الخلاف کی "علم اصول الفقہ" خصوصیت سے قابل ذکر ہے، ضرورت اس بات کی ہے کہ ہمارے مدارس میں چھٹی اور فراغ قلبی کے ساتھ ان کو قبول کریں اور داخل نصاب کریں اور اصول فقہ کی تدریس میں بھی لفظی مباحث، قیل و قال اور مفروضہ اعتراض و جواب کے بجائے فن پر زور دیں۔

④ قواعد فقہ کی نصاب میں شمولیت

چوتھی اہم ضرورت "قواعد فقہ" کی تعلیم ہے۔ یہ ایک اہم فن ہے، مگر نہ معلوم کیوں؟ شروع سے ہی دینی مدارس کی بے التفاتی اور بے توجہی کا شکار رہا ہے۔ بعض مدارس تکمیل افتاء وغیرہ میں ابن نجیم مصری کی "الاشباہ والنظائر" پڑھاتے ہیں، مگر تعلیم کی اصل مدت میں اس فن کے لئے

کوئی جگہ نہیں ہے۔ خود یہ کتاب بھی ہدایہ وغیرہ کی جماعت میں پڑھائی جاسکتی ہے، اپنے استناد و حسن بیان اور جودتِ ترتیب کے لحاظ سے اس کتاب کا جو مقام ہے وہ اہل علم کی نظر سے مخفی نہیں۔ غور کیا جائے تو فقہ اسلامی سے ان قواعد کا رشتہ بہ مقابلہ ان قواعد وضوابط کے زیادہ مضبوط ہے جو "اصول" کہلاتے ہیں، مگر ان کو نصاب میں کوئی جگہ نہیں دی گئی ہے ——— کاش اہل علم اس طرف توجہ فرمائیں۔

چند تجاویز

دارالعلوم دیوبند نے ۲۹ جولائی ۱۹۹۴ء کو اپنے یہاں نصاب اور نظامِ تعلیم کے سلسلہ میں ایک مشاورتی اجلاس طلب کیا تھا، راقم الحروف کے نام بھی دعوت نامہ آیا تھا۔ اس دعوت نامہ کے پسِ منظر میں دارالعلوم سبیل السّلام حیدرآباد کے ممتاز اساتذہ کرام کے مشورے کے بعد دارالعلوم دیوبند کے "مشاورتی اجلاس" کے لئے جو تحریر بطور "تجاویز" مرتب کی گئی تھی اس کے اندراج سے (سابقہ صفحات کے اعتبار سے) بعض خیالات کے تکرار کے باوجود مسئلہ کی مزید وضاحت ہو سکے گی۔

محمد رضوان القاسمی

نصابِ تعلیم

① نصابِ تعلیم میں بنیادی طور پر اس بات کو ملحوظ رکھنا چاہیے کہ ہماری تعلیم کا اصل مقصد حصولِ تقویٰ اور دینِ حق کی اشاعت اور اسکی حفاظت ہے۔ کسبِ معاش کی صلاحیت پیدا کرنا، اچھا لیبر اور کاریگر تیار کرنا ضمنی

حرف کے ماہرین اور محض زبان وادب کے شہسوار پیدا کرنا دینی مدارس کا مقصود نہیں، پس یہ ضروری ہے کہ مدارس کے نصاب اور نظام پر غور کرتے ہوئے ہمیشہ اس کے مقصد اول ہی کو پیشِ نظر رکھا جائے۔

(۲) ہمارے نصابِ تعلیم میں دو طرح کے علوم وفنون داخل ہیں ایک حصہ علومِ مقصودہ کا ہے، یہ قرآن وحدیث، تفسیر، فقہ، کلام، اصولِ تفسیر، اصول حدیث اور اصول فقہ ہیں۔ دوسرے تمام علوم وفنون کی حیثیت ذرائع اور وسائل کی ہے، دینی مدارس کے نصابِ تعلیم میں اس بات کا لحاظ رکھنا ضروری ہے کہ ہمیشہ ان علومِ مقصودہ کو برتری اور بنیادی اہمیت دی جائے اور نصاب میں ان کا تناسب زیادہ سے زیادہ بڑھایا جائے اور دوسرے علوم وفنون بقدرِ ضرورت پڑھائے جائیں کہ ان میں کمال نہ مقصود ہے، نہ مطلوب۔

(۳) موجودہ مروجہ نصاب میں اصولِ تفسیر پر کوئی قابلِ ذکر کتاب نہیں پڑھائی جاتی، حالانکہ اس موضوع پر قدیم کتابیں بھی موجود ہیں اور ماضی قریب میں بھی بعض بڑی معلومات افزا اور مفید کتابیں آگئی ہیں لہٰذا اس موضوع پر کوئی اہم اور جامع کتاب داخلِ نصاب کی جانی چاہیے۔

(۴) اصولِ حدیث کا ہمارے نصاب میں کوئی مستقل گھنٹہ نہیں ہے، یوں مقدمہ شیخ عبدالحق اور نخبۃ الفکر داخلِ نصاب ہے لیکن عملاً اس کی حیثیت محض "انگشتِ ششم" کی سی ہے۔ اس موضوع کے لئے کم سے کم ایک گھنٹہ مخصوص کیا جانا چاہیے۔

(۵) اصولِ فقہ کے موضوع پر گو تین کتابیں عام طور پر داخلِ نصاب ہیں لیکن عموماً وہ مکمل نہیں ہو پاتی ہیں، یا جو کتاب مکمل ہوتی ہے اس میں تمام

اصول کا احاطہ نہیں ہے۔ اس کے علاوہ اصولِ فقہ میں چاروں مکاتبِ فقہ کے درمیان جو اختلافِ رائے پایا جاتا تھا۔ اس سے بحث کرنے والی اور احناف اور متکلمین کے طریق کو جامع کوئی اصولی کتاب نہیں پڑھائی جاتی ہے، عالمِ عرب میں اس وقت شیخ ابوزہرہ، خضری بک، شیخ علی الخفیف، ڈاکٹر وھبۃ الزحیلی وغیرہ کی مختلف اہم اور قیمتی کتب اس موضوع پر موجود ہیں جن سے فائدہ اٹھایا جا سکتا ہے۔ ضرورت ہے کہ ایسی کسی کتاب کو بھی داخلِ نصاب کیا جائے۔

(۶) موجودہ دور میں مختلف نئے باطل فرقے پیدا ہو گئے ہیں، جیسے قادیانیت، بہائیت، انکارِ حدیث، لادینیت وغیرہ، اس کے علاوہ شیعیت وغیرہ پر بھی شرحِ عقائد میں کوئی تفصیلی تبصرہ نہیں کیا گیا ہے، متکلمین نے عام طور پر باقتضاءِ زمانہ وحالات، اعتزال اور خارجیت کے رد پر زیادہ زور دیا ہے۔ ضرورت ہے کہ قدیم تصریحات اور جدید تقاضوں کو ملحوظ رکھتے ہوئے علمِ کلام پر ایک نئی کتاب مرتب کی جائے جو موجودہ حالات کے تقاضوں کو پورا کرتی ہو اور اسے داخلِ نصاب کیا جائے۔

(۷) دورِ جدید نے بہت سے نئے نئے فقہی مسائل پیدا کر دیے ہیں اور آئے دن اس میں اضافہ ہی ہوتا جاتا ہے۔ ضرورت ہے کہ اس موضوع پر عربی زبان میں کوئی مستقل کتاب مرتب کر دی جائے، یا ایسی کلید تیار کر دی جائے جو اساتذۂ فقہ کی رہنمائی کرتی ہو کہ فلاں فلاں فقہی مباحث میں اساتذہ ان جدید مسائل کو طلبہ کے سامنے بیان کر دیں اور جس طرح بریلویت وغیرہ کے رد میں اساتذہ موقع بہ موقع طلبہ کی رہنمائی کرتے رہتے ہیں، ایسے فقہی مسائل میں بھی طلبہ کی رہنمائی کیا کریں، یہ وقت کی

نہایت اہم ضرورت ہے۔

(۸) فنِ تفسیر میں ہمارے یہاں صرف جلالین پڑھائی جاتی ہے اور کہنا چاہیئے کہ خود جلالین بھی قرآن مجید کا "ترجمہ" ہی ہے۔ ضرورت اس بات کی ہے کہ تفسیر کے موضوع پر کوئی ایک اور کتاب بھی شریک نصاب کی جائے جس میں تفسیر بالنصوص پر زور دیا گیا ہو۔

(۹) نصاب میں انگریزی زبان کی منتہی درجوں تک شمولیت، اصل مقصود کے حصول میں مضر بھی ہوگی اور طلبہ کی توجہ شاید علومِ دینیہ سے زیادہ علومِ عصریہ کی طرف مبذول ہو جائے، اس لئے یہ تو مناسب نہیں، البتہ یہ بات مناسب ہے کہ چہارم عربی تک انگریزی داخل کی جائے اور میڈل اسکول کے معیار کی انگریزی تعلیم ان کو حاصل ہو جائے۔

(۱۰) یہ بھی ضروری ہے کہ جغرافیہ، تاریخِ ہند، تاریخِ اسلام، تاریخِ عالم، معاشیات اور علمِ شہریت، ان تمام علوم کی صرف مبادیات (جن سے اصطلاحات اور بنیادی باتوں کا علم ہو سکے) پڑھادی جائیں اور پنجم تک ہر جماعت میں ان میں سے ایک ایک فن کی کتاب داخلِ نصاب کی جائے۔ عام طور پر فضلاءِ مدارس کے بارے میں یہ تصور عام ہوتا جارہا ہے کہ وہ معلوماتِ عامہ سے اس قدر بے خبر ہوتے ہیں کہ نئے حالات میں انکی آراء، واقعات اور حقائق سے کوئی مطابقت نہیں رکھتیں، پس اگر ان علوم کی مبادیات کو داخلِ نصاب کرلیا جائے کہ علومِ اسلامی کو سمجھنے اور سمجھانے اور حالات و واقعات پر منطبق کرنے میں ان سے خدمت لی جائے گی تو کوئی مضائقہ نظر نہیں آتا۔

(۱۱) یہ بات بھی مناسب محسوس ہوتی ہے کہ ہر جماعت میں خارجی مطالعہ

کا بھی ایک نصاب ہو اور اس میں ایک خاص تربیت کے ساتھ مختلف اسلامی علوم وفنون اور علماء کو پیش آنے والی ضروریات کی بابت مفید کتابوں کا مطالعہ ہو جائے اور یہ کتابیں باضابطہ امتحان کا موضوع تصور کی جائیں۔

(۱۲) دینی تعلیم کے ساتھ ٹکنیکی اور صنعتی تعلیم مدارس کے مقاصد کے لئے نہایت مضر اور بے فیض ہوگی۔ غالباً خود دارالعلوم دیوبند کے دارالصنائع کا تجربہ کچھ بہت ثمر آور نہیں رہا ہے، اس لئے مدارس میں ایسے نظام سے گریز ہی بہتر ہے۔ البتہ اگر الگ سے شعبۂ صنعت وحرفت ہو، اس کے لئے ایسے اذہان کے حامل طلبہ کا انتخاب بھی ہو تو جگہ کی فراخی اور مالی وسعت کے لحاظ سے بنیادی دینی تعلیم کے ساتھ ایسے شعبہ کا قیام بعض اعتبارات سے مفید ہوگا، تاہم اس میں حزم واحتیاط اور شعور وبصیرت کی ضرورت ہے تاکہ تحقیقی علمِ دین اور صنعتی تربیت (مع بنیادی دینی تعلیم) کے فرق اور ضرورت واہمیت کو الگ الگ محسوس کیا جاسکے۔

(۱۳) بعض مشکل کتابوں کی جگہ ایسی آسان کتاب کا انتخاب مناسب محسوس ہوتا ہے، جس میں لفظی بحثیں کم ہوں اور فن پر زیادہ توجہ دی گئی ہو، جیسے مختصر المعانی کی جگہ البلاغۃ الواضحۃ زیادہ مناسب ہوگی ـــــ کتابوں کے انتخاب میں طلبہ کی نفسیات اور سن وسال کے تقاضوں کا بھی لحاظ ضروری ہے۔ اس سلسلہ میں جسارت کے عفو خواہی کے ساتھ نورالایضاح کا نام لینا مناسب ہوگا، ایسی کتابوں کا متبادل تلاش اور فراہم کرنا مناسب ہے۔

(۱۴) اسی طرح ادب میں ایسی کتابیں جو جاہلی ادب اور دینی اور اخلاقی روایات سے آزاد ادب کی نمائندگی کرتی ہوں، کے مقابلہ میں ایسی کتابوں کو ترجیح دینے کی ضرورت ہے جو اسلامی رنگ وآہنگ کا پیکر ہوں، جیسے

مقامات کی جگہ مختارات۔

(۱۵) کتابوں کے انتخاب میں، عرب ممالک کی مختلف فنون میں خاص نصابی ہی نقطۂ نظر سے مرتب کی گئی جدید مطبوعات کو ملحوظ رکھنا اور ان سے فائدہ اٹھانا بھی عین مناسب ہوگا، کہ عالم عرب میں ماضی قریب میں اچھی اور قابلِ لحاظ محنت ہوئی ہے، اور ان سے مستفید ہونا "الحکمة ضالة المؤمن" کا مصداق ہے۔ ایسی مفید کتابوں کے حاصل کرنے یا انہیں ہندوستان ہی میں طبع کرانے کے مسئلہ کو بھی حل کرنا نہایت ضروری ہے۔

(۱۶) ہمارا موجودہ نصابِ تعلیم، میزان سے شروع ہوکر بخاری پر ختم ہوتا ہے اور بیچ میں کوئی ایسا وقفہ نہیں جس میں طالبِ علم دم لے سکے بعض طلبہ جن کی ذہنی استعداد کمزور ہوتی ہے، وہ اس کی وجہ سے بہ تکلف دورۂ حدیث تک پہنچتے یا پہنچائے جاتے ہیں۔ اگر درمیان میں عالمیت یا کسی اور نام سے ایک سندی درجہ قائم کر دیا جائے تو ایسے طلبہ یہاں اپنی تعلیم روک سکتے ہیں اور اپنی صلاحیت کے مطابق دین و ملت کی خدمت کر سکتے ہیں۔

(۱۷) یہ بات بھی مناسب ہوگی کہ نصاب میں بعض کتب کی بابت اختیار رکھا جائے کہ اس جماعت میں فلاں مضمون کی یہ یا یہ کتاب پڑھائی جائے۔ اس طرح دینی مدارس کے درمیان نصاب کے اعتبار سے زیادہ قربت پیدا ہو سکے گی اور ایک جگہ کے طلبہ کو دوسری جگہ داخلہ لینے میں سہولت بھی ہوگی۔

طریقۂ تعلیم

نصابِ تعلیم کے ساتھ طریقۂ تعلیم پر بھی توجہ بہت ضروری ہے، طریقۂ تعلیم کے بابت کچھ ضروری امور جن پر توجہ کرنا مناسب ہوگا حسبِ ذیل ہیں:

۱۔ سب سے اہم مسئلہ تدریسی تربیت کا ہے، یہ نہایت اہم کام ہے اور اس کے ذریعہ افراد سازی کا بڑا کام انجام دیا جاسکتا ہے اس کے لئے بڑی درس گاہوں میں تدریس و تربیت کا ایک مستقل شعبہ قائم کرنے کی ضرورت ہے، دوسرے ہفت روزہ یا پندرہ روزہ تربیتی کیمپ لگانے کی اور تجربہ کار اساتذہ کے تجربات سے نئے اساتذہ کو فائدہ اٹھانے کا موقع فراہم کرنے کی سخت ضرورت ہے۔

دارالعلوم دیوبند میں ابتدائی دور کی طرح پھر معین مدرس اور معین مفتی کے تقرر کا جو آغاز کیا ہے، یہ بھی نہایت بہتر اور مستحسن قدم ہے اور امید ہے کہ اس سے افراد سازی کا وہ ضروری کام کسی درجہ میں ہوسکے گا جس کی طرف دارالعلوم کے اولین بزرگوں کی خاصی توجہ تھی اور عرصہ سے جو کام بالکل متروک ہو چکا تھا۔

۲۔ یہ بھی ضروری ہے کہ مختلف جماعتوں میں طلبہ کی تعداد کی تحدید کردی جائے کہ اس جماعت میں اتنی تعداد سے زیادہ طلبہ نہ رکھے جائیں۔ اگر تعداد اس سے زیادہ ہو جائے تو اس کے لئے نئی ترتیب قائم کردی جائے۔

صورتِ حال یہ ہے کہ بڑی درسگاہوں کی طرف طلبہ کا سیلِ رواں

اور ایک ایک جماعت میں طلبہ کی اتنی غیر معمولی تعداد داخل ہے جو تعلیمی نفسیات کی رو سے مفید ہوں ——— اب ان کا دیکھا دیکھی نسبتاً کم معروف درسگاہیں بہ تکلف طلبہ کی تعداد کو بڑھاتی ہیں اور جن شہروں میں ایک سے زیادہ مدارس ہیں وہاں پر باضابطہ تعداد کا مقابلہ ہوتا ہے اور خوشامد کرکے طلبہ لائے جاتے ہیں اور وہ مطلوبانہ شان کے ساتھ مدرسوں میں جاتے ہیں، یہ صورت حال نہایت افسوسناک اور معیار تعلیم کے لئے بہت نقصان دہ ہے، اس سلسلہ میں بڑی درسگاہوں کو پہل کرنی چاہیے اور مختلف جماعتوں میں طلبہ کو محدود رکھنے کی سعی کی جانی چاہیے کہ کمیت میں اضافہ خود بخود کیفیت میں انحطاط پیدا کرتا جاتا ہے۔

۳۔ یہ بھی ضروری ہے کہ ابتدائی جماعتوں میں اساتذہ کو نفس عبارت کی تفہیم اور لمبی تقریروں سے اجتناب کا پابند کیا جائے، نیز سوم، چہارم عربی کی جماعتوں تک روزانہ گذشتہ دن کا سبق اور ہفتہ میں ایک دن ہفتہ وار آموختہ سننے کا اہتمام کیا جائے اور تمرینات پر خوب توجہ دی جائے، اسی طرح ھدایۃ النحو اور کافیہ کی جماعت تک بلیک بورڈ کے استعمال پر بھی توجہ کی جانی چاہیے کہ اس سے تفہیم میں اور خود طلبہ کی صلاحیت کے جائزہ میں مدد ملتی ہے۔

۴۔ زمانہ و حالات سے باخبری اور دینی معلوماتِ عامہ کے لئے مختلف جدید موضوعات اور باطل افکار و نظریات پر توسیعی خطبات اور محاضرات کا اہتمام ضرور کیا جانا چاہیے، اس سلسلہ میں دارالعلوم دیوبند کی طرف سے ختم نبوت پر اور اسلامک فقہ اکیڈمی کی طرف سے فقہی موضوعات پر خطبات اور تربیتی اجتماعات کا جو اہتمام ہو رہا ہے وہ قابلِ تحسین ہے۔

دینی مدارس ـــــ مسائل و مشکلات

(۱) مدارس میں اس وقت بعض مواقع پر انتشار، باہمی منافست، انتظامی عملہ اور کہیں اساتذہ و طلبہ میں تصادم کے جو واقعات پیش آجاتے ہیں، ان سے اندرونی مشکلات کے حل کیلئے ایک ایسے ضابطۂ اخلاق کی ترتیب ضروری ہے جو ان مشکلات پر قابو پانے میں ممد و معاون ہو، اس ضابطۂ اخلاق میں منتظمین، اساتذہ اور طلبہ کے واجبی حقوق اور ان کی طرف سے پیش آنیوالے ناواجبی اقدامات کا بھی مناسب طور پر احاطہ کیا گیا ہو، نیز یہ ضابطۂ اخلاق مختلف دینی مدارس کے درمیان تعلقات اور ایک دوسرے کے ساتھ اخلاقی تعاون کے طریقۂ کار کو بھی متعین کرتا ہو۔

(۲) دینی مدارس اور مساجد کے حقیقی کردار کو متأثر کرنے کے لئے اس وقت خارجی طور پر جو نامناسب کوششیں ہو رہی ہیں اور مسلمانوں کے ان خالص مذہبی اداروں میں دخل اندازی کی جو سعی نامشکور جاری ہے، ضرورت ہے کہ دینی مدارس کے ذمہ داران اور اکابر علماء ان حالات پر نظر رکھیں اور ان کے سدباب کی مناسب اور مؤثر تدبیر اختیار کریں بلکہ اس طرح کی سازشوں پر نگاہ رکھنے اور دینی مدارس و مساجد کا تحفظ کرنے کی غرض سے کوئی ایسا مستقل اور ملک گیر سطح کا سربوط نظام قائم کرنا چاہیے، کیوں کہ وقت اور

حالات کی نباضی اور زمانہ شناسی ہمارے اکابر و اسلاف کا طرۂ امتیاز رہا ہے۔

(۳) درسیات میں جو کتابیں داخل ہیں یا داخل کرنا چاہتے ہیں، بعض حالات میں ان کی اور ان کی شروح کی عدم دستیابی ایک مسئلہ ہے۔ نئے دور نے کتابوں کی پرکشش طباعت کا نیا انداز قائم کیا ہے۔ عرب ممالک نے اس سلسلہ میں ایک اچھا معیار قائم کیا ہے۔ اس کی طرف بھی ارباب دینی مدارس کی توجہ نہیں ہے، ضرورت ہے کہ اس مسئلہ کو حل کیا جائے، مطلوبہ کتابیں اور ان کی شروح مناسب سائز پر معیاری طباعت کے ساتھ وافر تعداد میں فراہم کرنے کی سبیل منظم منصوبے کے ساتھ نکالی جائے۔

(۴) علماء، فضلاء اور دینی خدمت گذاروں کے اندر دیہات کے علاقوں میں کام کرنے کی اسپرٹ کم ہوگئی ہے جس کے نتیجے میں دیہات میں دینی تعلیم کا نظام ٹھیک ڈھنگ سے نہیں ہے۔ دینی فکر رکھنے والے اس سلسلہ میں بڑی بے چینی محسوس کر رہے ہیں، اس مسئلہ کے تمام پہلوؤں کو سامنے رکھتے ہوئے فوری مناسب حل، وقت کی اہم ترین ضرورت ہے

(۵) اعلیٰ دینی تعلیم حاصل کرنے والے طلبہ کی ایسی تربیت کی بھی اس زمانہ میں شدت سے ضرورت محسوس کی جارہی ہے کہ ان کے اندر "معاشی فکر" سے زیادہ "داعیانہ ذہن" پیدا ہو۔ "سند" جاری کرنے سے پہلے اس کا اطمینان حاصل کرنا بھی ضروری ہے کہ جمعہ، عیدین اور نکاح کے خطبے انہیں یاد ہیں یا نہیں؟ قرآن مجید کی بعض معروف سورتیں اور آخر کے کم از کم دو پارے بھی حفظ ہونے چاہئیں، تجوید کا امتحان بھی لازمی ہے۔

(۶) طلبہ کی ذہنی سطح کا جائزہ لے کر "زمرہ بندی" کا مسئلہ بھی اہم ہے

تاکہ بنیادی دینی تعلیم، درمیانی دینی تعلیم اور اعلیٰ دینی تعلیم کا فیصلہ ان کے حق میں کیا جاسکے، اچھے ذہین اور محنتی طلبہ پر خصوصی نظر رہے اور انکی صلاحیتوں اور مزاج و رجحان کو دیکھ کر ان کے لئے مزید حصولِ علم کا خصوصی میدان منتخب کیا جاسکے، ایسے طلبہ کی ہمہ جہتی حوصلہ افزائی ہوتی رہے تو مختلف میدان میں "رجال کار" کا حوصلہ بخش اضافہ ہوگا، حضرت امام ابوحنیفہؒ اور بعض دوسرے اکابر نے اس سلسلہ میں اپنے شاگردوں کے ساتھ "حسنِ سلوک" کا معاملہ کر کے ایک بہترین مثال قائم کی ہے۔

مرکز البحوث والدعوة
حیدرآباد الهند

یادداشت

اس کتاب سے

"جدید چیلنج کے مقابلہ اور عصری تقاضوں کی رعایت سے میری مراد یہ ہے کہ طالبانِ مدارس درس گاہوں کے مضبوط حصار سے باہر نکلنے کے بعد جن حالات سے دوچار ہوں وہ ان کے لئے نامانوس اور اجنبی نہ ہوں اور یہ سوچنے پر مجبور نہ ہوجائیں کہ انہوں نے اپنی عمر کا ایک معتدبہ حصہ ایک ایسے قلعہ میں بند رہ کر گذارا ہے جس کا باہر کی دنیا سے کوئی رشتہ نہ تھا بلکہ وہ اس پوزیشن میں ہوں کہ موجودہ تمدن، جس کی رگ رگ میں الحاد و دہریت کا خون دوڑ رہا ہے اور جس میں علوم و معارف کے ذریعہ خالقِ کائنات سے "جڑنے" کے بجائے "ٹوٹنے" اور "قرار" کے بجائے "فرار" کی تعلیم دی جاتی ہے، کو اسلام اور اخلاقی اقدار کے سانچہ میں ڈھال کر مسلمان بنا سکیں، اسلام کے پیش کردہ نظامِ حیات اور اس کے تمام شعبوں پر ان کو گہری بصیرت حاصل ہو۔ اسلام کے خلاف ہونے والے فکری اور نظریاتی اعتراضات سے بھی وہ نابلد نہ ہوں اور وہ اس کا مسکت جواب دینے کی پوزیشن میں ہوں۔ نیز اس پیغام کو عام کرنے کیلئے داعیانہ کردار ادا کرنے کی صلاحیت بھی رکھتے ہوں، اس کا جذبہ بھی اور اس پر کامل وثوق بھی۔

جدید چیلنج کے مقابلے اور عصری تقاضوں سے ہم آہنگ ہونے سے میری مراد ہرگز یہ نہیں ہے کہ بعض تجدد پسندوں اور نام نہاد روشن خیالوں کی طرح زمانہ پر اسلام کی چھاپ ڈالنے کے بجائے خود اسلام کو تراش خراش کر کسی طرح موجودہ ملحدانہ تہذیب پر فٹ کر دیا جائے اور مغرب سے اٹھنے والی ہر آواز پر سمعنا واطعنا کہہ کر اسلام پر اس کو مسلط کیا جاتا رہے۔" (مؤلف)